تاریخ فہمی

ڈاکٹر مبارک علی

تاریخ پبلیکیشنز
بک سٹریٹ 68- مزنگ روڈ لاہور، پاکستان
e-mail: tarikh.publishers@gmail.com

نام کتاب : تاریخ فہمی
مصنف : ڈاکٹر مبارک علی
اہتمام : ظہور احمد خاں
پبلشرز : **تاریخ پبلیکیشنز**
بک سٹریٹ 68- مزنگ روڈ لاہور، پاکستان
کمپوزنگ : فکشن کمپوزنگ اینڈ گرافکس، لاہور
پرنٹرز : سید محمد شاہ پرنٹرز، لاہور
سرورق : نین تارا
اشاعت : 2014ء
قیمت : -/300 روپے

تقسیم کار:

فکشن ہاؤس: بک سٹریٹ 68- مزنگ روڈ لاہور، فون: 37237430-37249218-042

فکشن ہاؤس: 52,53 رابعہ سکوائر حیدر چوک حیدر آباد، فون: 2780608-022

فکشن ہاؤس: نوشین سنٹر، فرسٹ فلور دوکان نمبر 5 اردو بازار کراچی، فون: 32603056-021

● لاہور ● حیدر آباد ● کراچی
e-mail: fictionhouse2004@hotmail.com

انتساب

پروفیسر مقصود احمد

کے

نام

فہرست

پیش لفظ

یہ مضامین محترم محمود شام کے کہنے پر روزنامہ ''جہان پاکستان'' میں لکھے گئے۔ ان مضامین کے موضوعات کا تعلق ہمارے معاشرے کے مسائل سے ہے۔ ان کا تجزیہ تاریخی تناظر میں کیا گیا ہے۔ امید ہے کہ یہ مضامین قارئین میں تاریخی شعور کو پیدا کرنے میں مدد دیں گے۔

ڈاکٹر مبارک علی

15- ستمبر 2014ء

لاہور

تاریخ کا مضمون

علم کے پھیلاؤ کے ساتھ ساتھ اس کو مختلف مضامین کی شکل میں تقسیم کر دیا گیا ہے۔ جب افلاطون نے اکیڈمی کے نام سے یونیورسٹی قائم کی تو اس میں فلسفہ کے مضمون کی اہمیت تھی، اور اس سے متعلق سیاسیات، اخلاقیات، اور جمالیات کو پڑھایا جاتا تھا۔ اس کے شاگرد ارسطو کی یونیورسٹی لےسیم (Lyceum) میں ارسطو نے علم کی دوسری شاخوں کو متعارف کرایا۔ اس نے اپنے وقت کے اہم موضوعات پر لکھا، جن میں فلسفہ کے علاوہ شاعری، المیہ، سیاسیات، طبیعات اور مابعدالطبیعات وغیرہ شامل ہیں۔ اس نے سب سے پہلے لبرل علم کی اصطلاح کو استعمال کیا۔

رومیوں کے عہد میں، ایک تو انہوں نے یونانیوں کی علمی میراث کو اختیار کیا دوسرے انہوں نے قانون کے علم کو اہمیت دی، فن خطابت جس کی ابتداء یونان سے ہو چکی تھی، اس کو بھی نصاب کا حصہ بنایا۔

عہد وسطیٰ میں جب چرچ کا معاشرہ پر تسلط قائم ہوا، تو اب تھیالوجی یا الٰہیات کو دوسرے مضامین پر فوقیت دی گئی اور فلسفہ وادب اور دوسرے مضامین اس کے ماتحت ہو گئے جن کا مقصد یہ تھا کہ مذہبی عقائد کو درست ثابت کیا جائے۔

علم کے پھیلاؤ میں ایک انقلابی تبدیلی اس وقت آئی جب ریناساں کے عہد میں انسانیت دوست (Humanists) دانشوروں نے نصاب کو تبدیل کر کے اس میں قانون، فن خطابت کے ساتھ ساتھ ادب، موسیقی، ریاضی، تاریخ، سیاسیات اور جغرافیہ کو شامل کیا، اس لئے ابتداء میں یہ علوم ہیومنٹیز (Humanities) کہلائے۔

جب پندرہویں اور سولہویں صدیوں میں سائنسی انقلاب آیا تو سائنس کی اہمیت ہوئی، اٹھارہویں صدی میں روشن خیالی کی تحریک کے دوران دانشوروں نے سائنس، عقلیت پرستی، اور

ترقی کے نظریات کو مقبول بنایا، اس وجہ سے آہستہ آہستہ علوم کی تقسیم ہونے لگی۔ سائنسدانوں کے لئے پہلے نیچرل فلسفی کی اصطلاح استعمال ہوتی تھی، جو بعد میں سائنسدان کہلانے لگے۔

جب جرمنی میں جدید یونیورسٹی کی بنیاد انیسویں صدی میں ہوئی تو انہوں نے علوم کو مختلف شعبوں میں تقسیم کر دیا۔ جرمن یونیورسٹیوں میں دو سائنٹسٹ فیکلٹیز ہوتی ہیں، ایک تو روحانی علوم اور دوسری نیچرل علوم کہلاتی ہیں۔ روحانی علوم کی فیکلٹی میں فلسفہ، ادب، تاریخ، جغرافیہ، معاشیات، سیاسیات، لسانیات اور موسیقی وغیرہ کے شعبے ہوتے ہیں، جبکہ نیچرل علوم کی فیکلٹی میں سائنس کے شعبہ ہیں۔

چونکہ سائنس کا تعلق دلیل، تجربہ، اور مشاہدہ پر ہے، اس لئے جدید دور میں ہر مضمون نے خود کو سائنس میں شامل کرنے کی کوشش کی۔ اس وجہ سے سوشل سائنس کی اصطلاح معاشیات، نفسیات، سیاسیات، شوشالوجی، انتھراپالوجی اور تاریخ اور جغرافیہ کے لئے استعمال ہونے لگی، جبکہ ادب، فلسفہ، موسیقی، جمالیات اور اخلاقیات Humanities میں شامل ہوگئیں۔ اس عمل نے سوشل سائنس کو Humanities سے خارج کر کے ان علوم کو سائنس بنا دیا۔

سوشل سائنس کے علوم، ہیومنٹیز سے علیحدہ ہو کر دلیل اور عقلیت پرستی کے بندھنوں میں بندھ گئے۔ اس وجہ سے ان مضامین کے اندر جو جذبات اور رومان تھا، وہ نہ رہا۔

یہ انسانی ذہن اور معاشرہ کو بطور Object یا بطور شے کے دیکھتے ہیں، اور ان کا تجزیہ کرتے ہیں، جس کی وجہ سے یہ مضامین انسانی جذبات اور اس کی گہرائیوں کو نہیں دیکھ پاتے ہیں۔

تاریخ میں بیسویں صدی کی بڑی اہمیت ہے، کیونکہ اس نے نہ صرف پچھلی صدیوں کی میراث کی حفاظت کی بلکہ تیزی سے سائنس، ٹکنالوجی، سماجی علوم اور ہیومنٹیز (Humanities) میں انقلابی تبدیلیاں کیں۔ جیسے جیسے معاشرہ ان تبدیلیوں کے نتیجہ میں پیچیدہ ہوتا چلا گیا اور نئے مسائل سے دوچار ہوا، اسی طرح سے سماجی علوم اور ہیومنٹیز نے اپنے دائرہ کار کو پھیلایا۔ اس کے نتیجہ میں معاشرہ میں پروفیشنل طبقوں کا وجود عمل میں آیا۔ جس طرح سے ڈاکٹر، انجینئر، اکاؤنٹنٹ، اور منیجر پروفیشنل طبقوں میں ابھرے اسی طرح سماجی علوم کے ماہرین کا طبقہ پیدا ہوا، جن میں تاریخ، سیاسیات، عمرانیات، بشریات، نفسیات، فلسفہ، معیشت، اور بین الاقوامی امور کے ماہرین شامل تھے، اس طرح آرٹ، موسیقی، رقص، فن تعمیر، مجسمہ تراشی، اور ادب میں بھی پروفیشنل لوگوں

نے اپنی پیشہ ورانہ انجمنیں بنائیں۔

تاریخ کے مضمون میں پروفیشنل مورخ، اس وقت باعمل ہوئے جب یونیورسٹیوں میں اس مضمون کو پڑھایا جانے لگا۔ انیسویں صدی میں جرمنی میں لیوپولڈ رانکے (Leopold Ranke) اور اس کے ساتھیوں اور شاگردوں نے تاریخ نویسی میں انقلابی تبدیلیاں کیں۔ اس لئے ایک مورخ کے لئے یہ لازمی ہوگیا کہ وہ تحقیق کے سلسلہ میں مکمل طور پر تربیت حاصل کرے، تحقیق کے نئے طریقوں، اور ان کے استعمال نے مورخوں کے پروفیشن کو مشکل بنا دیا۔ اب سخت تربیت جس میں ماخذوں کا مطالعہ، کئی زبانوں کا جاننا، اور مواد کو ترتیب کے ساتھ، اعداد و شمار کی روشنی میں، دلیل کے ساتھ پیش کرنا، خاص طور سے جب معاشرے کے رجحانات کو سمجھنے کے لئے مختلف نظریات یا تھیوریز پیدا ہوئیں، جن میں نیشنل ازم، سوشل ازم، امپیریل ازم، فیمن ازم، اور پازیٹو ازم یا ثبوتیت پسندی شامل ہیں، ان کی روشنی میں واقعات کی توضیح اور تشریح کرنا۔

ایک طرف تو تاریخ کا مضمون اپنی جگہ کئی شعبوں میں تقسیم ہوا، دوسرے اس سے علیحدہ ہو کر نئے مضامین وجود میں آئے۔ ایک زمانہ میں آثارِ قدیمہ، اور سیاسیات تاریخ میں شامل تھے، اب یہ جداگانہ حیثیت کے حامل ہوگئے ہیں۔ علم کے اس پھیلاؤ میں تاریخ کو بھی دوسرے مضامین کے خیالات سے استفادہ کرنا پڑا، جن میں معاشیات، عمرانیات، بشریات اور نفسیات وغیرہ شامل ہیں۔ اس عمل کی وجہ سے کسی کے لئے بغیر تربیت کے مورخ بننا اب سہل نہیں ہے۔ اس کے لئے یونیورسٹی اور تحقیقی اداروں کی ضرورت ہوگئی ہے۔

اس کو ذہن میں رکھتے ہوئے جب ہم پاکستان میں تاریخ کے مضمون اور مورخوں کے بارے میں نظر ڈالتے ہیں، تو ہمیں یہاں پروفیشنل مورخوں کا وجود نظر نہیں آتا ہے۔ ایک ایسا طبقہ کہ جو تاریخ کے مختلف شعبوں میں تحقیق کر رہا ہو، اور معاشرے کی تبدیلیوں، اور ان کے مسائل پر بحث کر رہا ہو۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ ہماری یونیورسٹیوں میں تاریخ کا شعبہ صرف نصاب کی تعلیم دیتا ہے۔ مورخوں کی تربیت کے لئے جس عمل کی ضرورت ہے وہ ہماری یونیورسٹیوں میں نہیں ہے۔ اس کے علاوہ عالمی طور پر جو تاریخ کے مضمون میں تبدیلیاں ہو رہی ہیں، ان سے ناواقف ہیں، ہمارے ہاں پابندی سے تاریخ پر کانفرنسوں کا انعقاد نہیں ہوتا ہے اور نہ ہی بین الاقوامی کانفرنسوں میں

شرکت کی جاتی ہے۔ نہ ہی ہماری یونیورسٹیاں غیر ملکی مورخوں کو لیکچرز کے لئے بلاتی ہیں۔ اس کی وجہ سے ہم بین الاقوامی اکیڈمک اور اس کی تحقیقات سے کٹ گئے ہیں۔ ہماری لائبریریوں میں بہت کم تاریخ کے متعلق تحقیقی جرنلز آتے ہیں، اور ہم ان نئی کتابوں سے بھی کم واقف ہیں، جو تاریخ کے مختلف موضوعات پر شائع ہو رہی ہیں، اس صورت میں ہمارے تاریخ کے استادوں کے لئے یہی رہ جاتا ہے کہ وہ پرانے نصاب اور نظریات کے مطابق تاریخ کو پڑھاتے رہیں۔ جب یہ مضمون جامد ہو کر رہ گیا، اور اس میں نئی تحقیقات کی گنجائش نہیں رہی، تو اس صورت میں اس کی اہمیت بھی کم سے کم ہو گئی، اور عام لوگوں میں اس کے بارے میں یہ تاثر ابھرا کہ یہ محض بادشاہوں کی کہانیاں ہیں، یا ماضی کے واقعات کا مجموعہ ہے، جس کا تعلق ہماری آج کی دنیا سے نہیں ہے اس لئے اس مضمون کی کیا ضرورت ہے؟

پاکستان کی تاریخ نویسی کی جڑیں کولونیل دور کی تاریخ نویسی میں پیوست ہیں، قومی آزادی کی جدوجہد میں ہندوستان کے مورخوں نے تاریخ کی مدد سے قوم پرستی کے جذبات کو ابھارا۔ اس میں الٰہ آباد یونیورسٹی کے شعبہ تاریخ کا بڑا حصہ ہے، جس کے مورخوں نے عہد مغلیہ کی تاریخ کے ذریعہ مشترک کلچر کی تشکیل کو ابھارا، مگر جب سیاست میں ہندو مسلم اختلافات ہوئے اور دوقومی نظریہ سیاست میں آیا تو اس کے نتیجہ میں تاریخ میں بھی فرقہ وارانہ خیالات آئے۔ تقسیم کے بعد پاکستان کے سیاستدانوں اور مورخوں کے لئے سب سے بڑا چیلنج یہ تھا کہ اس ملک کے وجود کو کیسے تاریخی طور پر درست اور جائز ثابت کیا جائے۔ اس لئے آئی۔ ایچ۔ قریشی، ایس۔ ایم۔ اکرام اور معین الحق نے دوقومی نظریہ کی بنیاد پر تاریخ کو لکھا۔ اس تاریخ نویسی میں مسلمان قوم کی شناخت اور تاریخ میں اس کو برقرار رکھنے کا سہرا علماء کے سر باندھا گیا جن میں شیخ احمد سرہندی، شاہ ولی اللہ، اور سیّد احمد شہید قابلِ ذکر ہیں۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پاکستان میں آہستہ آہستہ علماء کا عروج شروع ہوا، کیونکہ تاریخ میں وہ مسلمانوں کے محافظ اور مذہب کو تحفظ دینے والے تھے، اس لئے علماء کے عروج کے ساتھ معاشرہ میں مذہب کا تسلط اور مذہبی فرقہ واریت کے جذبات پیدا ہوئے، جو موجودہ دور میں اپنی پختگی کو پہنچ چکے ہیں۔

تاریخ نویسی کا ایک اور اہم پہلو یہ ہے کہ اسے شخصیتوں کے تناظر میں لکھا گیا ہے اور تبدیلی

کی دوسری قوتوں کونظرانداز کر دیا گیا ہے، لہٰذا اس کا نتیجہ یہ ہے کہ لوگوں میں یہ تاثر پیدا ہو گیا کہ ملک وقوم کی تقدیر صرف شخصیت بدلتی ہے، اس لئے ملک میں جب بھی آمر آئے اور مارشل لاء کا نفاذ کیا، لوگوں نے اس کا خیر مقدم کیا۔ شخصیت پرستی کے ان جذبات اور اثرات کی وجہ سے جمہوری ادارے اور روایات کمزور رہیں۔

پاکستان کی تاریخ نویسی کو مسخ کرنے میں نظریہ پاکستان ہے، ابتدائی مورخوں نے جب تاریخ کو اس تناظر میں لکھا تو انہوں نے واقعات کا تجزیہ فرقہ وارانہ نقطۂ نظر سے کیا۔ اس کا خاص طور سے اثر نصاب کی کتابوں پر ہوا، جن میں نظریہ کو جائز ثابت کرنے کی غرض سے تاریخی حقائق کو مسخ کر کے پیش کیا۔

لہٰذا پیشہ ورانہ مورخوں کی غیر موجودگی، ریاست کی جانب سے نظریہ اور ریاستی قوم پرستی پر زور، معاشرے کی تبدیلیوں کونظرانداز کر کے تاریخ کو روایتی انداز میں پیش کرنے کا نتیجہ یہ ہے کہ معاشرے میں تاریخی شعور کی کمی ہے، اس صورتِ حال سے فائدہ اٹھاتے ہوئے مصنفوں نے ڈائجسٹوں، اخباروں اور رسالوں میں ایک ایسی فرضی اور رومانوی تاریخ کی داستانوں کو مقبول بنا دیا ہے کہ جن کا تعلق تاریخ سے نہیں ہے۔ جب یہ تاریخ لوگوں کے ذہن کو بنائے گی تو اس سے مسخ شدہ تاریخی شعور پیدا ہوگا جو لوگوں کو گمراہ کرے گا۔

اس صورتِ حال کو دیکھتے ہوئے اس بات کی ضرورت ہے کہ روایتی تاریخ کو تبدیل کر کے اس مضمون میں جو نئی تبدیلیاں آئی ہیں انہیں شامل کیا جائے تا کہ یہ وقت کی ضرورت کو پورا کرے۔

آ ثارِقدیمہ اورتاریخ

انسان کے تخلیقی ذہن کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ اس نے دنیا کے تصور کو تبدیل کرتے ہوئے، نئی جدتیں کیں اور نئی تہذیب اور نئے کلچر کو پیدا کیا۔ ایک طرف انسان اس دنیا کو تبدیل کرنے میں مصروف تھا، تو وہیں اس کے مقابلہ میں فطرت اس کو تباہ کرنے میں مصروف تھی، زلزلے، سیلاب، طوفان، آتش فشاں پہاڑوں سے بہتا ہوا لاوا، اس نے ان کو اپنے اندر غرق کر کے چھپا دیا تھا، مگر اس کے باوجود انسان نے ہمت نہیں ہاری، اور تباہ شدہ ملبہ پر ایک اور نئی تہذیب کی بنیاد رکھ دی۔

چونکہ زیادہ تر اس دور کے شہر، قصبے اور گاؤں مٹی کے بنے ہوتے تھے، اس لئے یہ آب و ہوا کی تاب نہ لا کر ملبہ کی شکل اختیار کر لیتے تھے، لہٰذا قدیم تہذیبیں ان ملبوں کے ڈھیر کے نیچے دبی ایک عرصہ تک ماہرین آ ثارِقدیمہ کا انتظار کرتی رہیں کہ انہیں دریافت کریں اور انہیں دوبارہ سے نئی زندگی دے کر دنیا کے سامنے ان کی اہمیت کو اُجاگر کریں۔ قدیم تہذیبوں کے یہ آ ثار ایک جانب تو مٹی کے ڈھیر میں دبے ہوئے تھے، مگر دوسری جانب وہ آ ثار تھے کہ جو کھنڈرات کی شکل میں موجود تھے اور آنے والوں کو اپنی ماضی کی داستان خاموشی کی زبان میں سناتے تھے، جیسے اہرام مصر، سمیری تہذیب کے زغورت یا مندر، یا ہندوستان میں جگہ جگہ پھیلے ہوئے مندر اور اسٹوپ۔

کہتے ہیں کہ قدیم آ ثاروں کی تلاش میں کھدائی کا کام قدیم یونان میں ہوا تھا جس کا ذکر یونانی مورّخ تھیوسی ڈیڈیس نے کیا ہے، مگر یہ کوئی کسی منصوبے یا پلان کے تحت نہیں تھا۔

علم آ ثارِقدیمہ کی ابتداء 18ویں اور 19ویں صدیوں میں شروع ہوئی، ابتدائی دور میں اس میں وہ فنی مہارت نہیں تھی، مگر وقت کے ساتھ ٹیکنالوجی اور سائنس کی معلومات اور ایجادات نے اسے ایک فنی علم کی حیثیت دی، جس کی وجہ سے اب یہ علم تعلیم و تربیت کے ساتھ ساتھ فنی مہارت کے ساتھ

لیس ہے،اس لئے اب جوکھدائیاں ہوتی ہیں ان میں کوشش کی جاتی ہے کہ آثار کونقصان نہ ہو۔

ویسے کہا جاتا ہے کہ تہذیب جس قدر مٹی کے ڈھیر میں دبی اور مدفون محفوظ ہوتی ہے،اسی قدر یہ کھدائی کے بعد تباہ ہونے کے قریب ہو جاتی ہے کیونکہ اب آب و ہوا اور انسانوں کی آمدورفت اس کی خستگی اور شکستگی میں اضافہ کرتی ہے۔ دنیا بھر میں ماہرین آثارقدیمہ نے کھدائی کے روز نہ صرف پرانی تہذیبوں کو کتابوں کے اوراق سے نکال کران کو مادی شکل دی ہے بلکہ ایسی تہذیبوں کودریافت کیا ہے کہ جن سے اب تک لوگ واقف نہیں تھے۔ جب ان تہذیبوں کے رسم الخطوط کودریافت کرلیا گیا تو قدیم اور اَنجان دنیا لوگوں کے سامنے زندہ ہوکر آ گئی۔ان کے مذہبی عقائد،رسم ورواج،ادب وشاعری،تاریخ اورداستانوں نے ان کوآج کی دنیا سے قریب کردیا۔

لہٰذا آثارِقدیمہ کی دریافت نے تاریخ کواہمیت دی،اب اس کے دائرے میں انسان کے ارتقائی مراحل سے لے کرتہذیب کے ارتقاءاوراس کی ترقی کی مسلسل داستان موجود ہے۔

جس قدران آثاروں نے تاریخ کو مالا مال کیا ہے،اس قدر کسی اور دوسرے عناصر کا حصہ نہیں ہے۔مورخوں اور ماہرین آثارقدیمہ نے تاریخ کے اس طویل سفراور تسلسل کوسمجھنے کے لئے اس کومختلف ادوار میں تقسیم کیا ہے،مثلاً ماقبل تاریخ (Pre-History) کا دوراورتحریری تاریخ کا عہد ماقبل تاریخ کے دورکووہ اس عہد تک لاتے ہیں کہ جب کانسی کے زمانہ میں دنیا کی مشہورتہذیبی معاشروں میں لکھنے کا رواج ہوا۔اس لئے تحریر سے قبل کی تاریخ کا اہم ماخذ قدیم آثار ہیں،جن میں پائے جانے والے آلات،اوزار،ہتھیار، برتن اور عمارتیں ہیں۔ان کی مدد سے مورخین اس عہد کے لوگوں کی سماجی تاریخ کی تشکیل کرتے ہیں۔مزید سہولت کے لئے اس کو وہ قدیم پتھر کا زمانہ، درمیانی پتھر کا زمانہ اور جدید پتھر کا زمانہ کہتے ہیں کہ ان تین ادوار میں سماج میں کیا تبدیلیاں ہوئیں تھیں،اور پیداواری الات کی جدت نے سماجی نظام کو کیوں کراور کس طرح سے بدلا تھا۔

کانسی اورلوہے کے زمانے میں ان دومعدنیات نے جوآلات،اوزاراورہتھیاروں میں تبدیلی کی،اس کی وجہ سے تہذیب کی ابتداء ہوئی،شہر وجود میں آئے۔سیاسی نظام اورریاست کی تشکیل نے طبقاتی سماج کی ابتداء کی۔رسم الخط کی شروعات سے اندازہ ہوتا ہے کہ زبان میں اس قدرالفاظ کا ذخیرہ ہو چکا تھا کہ اب اس میں شاعری،قانون اوراحکامات کے ساتھ ساتھ داستانیں بیان کی جانے لگی تھیں۔

تہذیبوں کی تاریخ، جو آثار قدیمہ کی بنیاد پر تشکیل ہوتی ہے، یہ ایک دلچسپ اور سنسنی خیز داستان ہے کہ جس میں انسان متحرک اور زندہ نظر آتا ہے۔ جو مسلسل اس دنیا کو دلفریب اور رہنے کے قابل بنانے میں مصروف ہے۔ وہ آنے والی نسلوں کے لئے تہذیب کا یہ ورثہ چھوڑ جاتا ہے کہ جس کی بنیاد پر انسانی تہذیب اور آگے کی جانب چلتی ہے۔

اس لئے یہ قدیم آثار عبرت کی نشانی اور نمونہ نہیں ہیں۔ اسے زوال کی کہانی ضرور کہتے ہیں، مگر ان میں انسان کی جدوجہد، کاوش اور زندہ رہنے کی خواہش کا پورا پورا اظہار ہوتا ہے، اور اس سے یہ پیغام ملتا ہے کہ زندہ رہنے کے لئے اس دنیا کو خوبصورت اور دلکش بنانا ہوگا۔ ایک ایسی دنیا کہ جس میں ہر فرد کو اس کا لطف اٹھانے کے مواقع میسر ہوں۔

تاریخ کی پاکیزگی

ضیاءالدین برنی، جو تاریخ فیروز شاہی کا مصنف ہے، اس کا تعلق سلطنت دور کے عہد تغلق سے تھا۔ اس نے اپنی کتاب میں تاریخ کے بارے میں جن نظریات کا اظہار کیا ہے وہ بڑے دلچسپ ہیں وہ تاریخ پر مضمون کو مقدس اور پاکیزہ علم سمجھتا ہے اور اس کے ثبوت میں وہ دلائل دیتے ہوئے لکھتا ہے کہ اول تاریخ میں ہمیں انبیاء اور رسولوں کے حالات اور ان کتابوں کے بارے میں ذکر ملتا ہے کہ جو ان پر نازل ہوئیں، یہ علم انسان کو پاکیزگی اور پرہیزگاری کی جانب لے جاتا ہے۔ دوم، تاریخ احادیث کے سرمایہ کو محفوظ کئے ہوئے ہے، جو ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے واقعوں سے آگاہ کرتا ہے۔ اس میں غزواۃ اور جہاد کا ذکر بھی ہے، تاریخ کے ذریعہ ہی ہمیں صحابہ کرامؓ کی زندگی، ان کے معمولات اور ان کے کردار کے بارے میں معلوم ہوتا ہے جو ہمارے لئے مشعلِ راہ ہے۔

تاریخ کی تیسری اہم خصوصیت یہ ہے کہ اس سے شعور اور علم میں اضافہ ہوتا ہے، جس کی وجہ سے انسان میں تدبر اور معاملہ فہمی پیدا ہوتی ہے۔ تاریخ کے تجربے سے انسان سیکھتا ہے، اور ماضی میں جو غلطیاں ہوئی ہیں، ان سے اجتناب کرتا ہے۔ چونکہ تاریخ ماضی کے علم کو محفوظ رکھتی ہے، اس لئے آنے والے اس ورثہ سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس میں اور اضافہ کرتے ہیں۔

چوتھا فائدہ یہ ہے کہ حکمراں اور سلاطین جو تاریخ کو پڑھتے ہیں، وہ ماضی کے حکمرانوں اور ان کی حکمرانی سے پوری طرح واقف ہو جاتے ہیں۔ یہ علم ان کو یہ شعور دیتا ہے کہ اگر وہ کسی بحران میں مبتلا ہو جائیں، تو دیکھیں کہ ماضی کے حکمرانوں نے ایسے مواقع پر کونسی حکمت عملی اختیار کی اور ان حوادث سے اپنے آپ کو محفوظ کیا۔

پانچویں خصوصیت تاریخ کی یہ ہے کہ اس میں انبیاء اور رسولوں کے صبر و قناعت اور

پرہیزگاری کے بارے میں معلومات ہوتی ہیں، جو پڑھنے والے کو یہ حوصلہ دیتی ہیں کہ وہ بھی ان اوصاف کو اختیار کرے تا کہ اس دنیا میں سکون اور اطمینان کی زندگی گزار سکے۔

چھٹی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں عادل اور انصاف پسند حکمرانوں کے بارے میں تفصیلات ملتی ہیں کہ ان کے دور میں رعایا خوش حال اور پُر امن تھی۔ اس سے عدل اور انصاف کی برکتوں کا پتہ چلتا ہے۔ اس کے ساتھ ہی اس میں ان حکمرانوں اور سلاطین کی تاریخ بھی ہے کہ جو جابر اور ظالم تھے اور جنہوں نے رعایا کو پریشانی میں مبتلا رکھا۔ اب جب حکمراں ان دونوں کے بارے میں پڑھتے ہیں، تو انہیں اندازہ ہو جاتا ہے کہ عدل اور انصاف کی کیا قدر ہے اور تاریخ ایسے حکمرانوں کا ذکر خیر کے ساتھ کرتی ہے جب کہ ظالم و جابر حکمراں تاریخ میں بدنام جگہ پاتے ہیں۔

تاریخ کی ساتویں خصوصیت بیان کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اس میں مورخ کو سچائی کے ساتھ بات کرنی چاہئے۔ برنی لکھتا ہے کہ تاریخ اور سچائی کے بارے میں اگلے انبیاء اور بزرگان نے بڑا زور دیا ہے۔ جو لوگ تاریخ کو مسخ کرتے ہیں یا اس میں جھوٹ شامل کرتے ہیں، ایسے مورخوں پر خدا تعالیٰ کی جانب سے عذاب الٰہی نازل ہوتا ہے۔ اس موضوع پر روشنی ڈالتے ہوئے وہ لکھتا ہے کہ ''تاریخ میں قدیم لوگوں کی نیکیاں اور برائیاں، ان کے عدل اور ظلم، ان کے مستحق ہونے یا نہ ہونے، ان کے اوصاف اور نقائص ان کی عبادات اور جرائم، ان کی تکلیفوں اور رذالتوں کا ذکر کیا جاتا ہے، تا کہ بعد کی نسلوں میں اس کے پڑھنے والے، اس سے عبرت حاصل کر سکیں، اور حکمرانی کے فوائد اور نقصانات اور دنیا کے لوگوں کی نیکی اور بدکرداری سے آگاہ ہو سکیں، اور اس آگہی کے بعد نیکیوں کی پیروی اور بدکرداری سے پرہیز کر سکیں۔''

ضیاء الدین برنی، مورخوں کے بارے میں کہتا ہے کہ ''تاریخ نویسی کی لازمی شرائط میں ایک یہ ہے کہ دینداری کی وجہ سے مورخ کے لئے ضروری ہو جاتا ہے کہ جب وہ کسی بادشاہ یا اہم شخصیت کی فضیلت، نیکی، انصاف اور احسان کا حال لکھے تو اس کی رذالت اور برائیوں کو نہ چھپائے۔ تاریخ لکھنے میں مصاحبت کا انداز اختیار نہ کرے۔''

ضیاء الدین برنی نے تاریخ کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے۔ اس کا تعلق حکمرانوں، اور امراء سے تھا۔ اس نے اپنے عہد کے سلاطین کے دور حکمرانی کو نظر میں رکھتے ہوئے، اس پر زور دیا ہے کہ حکمرانوں کے لئے عدل اور انصاف کے ساتھ حکومت کرنا رعایا کی

خوش حالی کے لئے ضروری ہے۔لیکن وہ اس علم کو ایک خاص طبقہ میں محدود دیکھتا ہے۔اس کی تاریخ میں عام لوگوں کا کوئی ذکر نہیں ہے۔وہ خود نسلی طور پر انتہائی متعصب شخص تھا، جوذات پات، اوراعلیٰ اور ادنیٰ میں فرق کو قائم رکھنا معاشرہ کے لئے ضروری سمجھتا تھا۔عام لوگوں کے لئے وہ جو الفاظ استعمال کرتا ہے وہ کم ذات، کمینہ، رذیل اور کم رتبہ ہیں، اس لئے اس کے نزدیک اگر تاریخ میں عام لوگوں کا ذکر ہو گیا تو یہ تاریخ کی پاکیزگی کو ختم کر دے گا، اور تاریخ کا مضمون آلودہ ہو جائے گا۔

وہ اس انتہا تک نسل پرست اور متعصب تھا کہ اگر کوئی ادنیٰ ذات کا شخص کتنا ہی قابل اور لائق کیوں نہ ہو، اسے اعلیٰ عہدے پر فائز نہیں کرنا چاہئے، اس کے نزدیک یہ ایسا ہی ہے جیسے کتے کے گلے میں قیمتی موتیوں کا ہار پہنا کر اس کی اصلیت کو تبدیل کرنے کی کوشش کی جائے۔

مگر موجودہ دور میں اب تاریخ حکمرانوں کے ایوانوں سے نکل کر عوام تک آ گئی ہے اور عوام ہی تاریخ کا اصل مرکز ہو گئے ہیں۔ یہ سب اس لئے ہوا کہ بادشاہتوں اور حکمرانوں کے اختیارات ختم ہوئے، ان کا اقتدار کمزور ہوا، اور جمہوریت نے عوام کو طاقت و اقتدار دیا۔اس نے تاریخ کے دھارے کو بھی بدل کر رکھ دیا۔تاریخ کی پاکیزگی کا وہ تصور جو ضیاء الدین برنی کا تھا، اب وہ نہ رہا، اس پاکیزگی نے ایک نئی شکل اختیار کر لی ہے۔

کیا تاریخ کے فوائد اور نقصانات ہیں؟

تاریخ نیچرل سائنس کی طرح کا مضمون نہیں ہے کہ جس کو لیبارٹریز میں تجربات کے بعد اس کے واقعات کے بارے میں یقینی طور پر کہا جا سکے اور ان تجربات کی روشنی میں جو قوانین دریافت ہوں، اس سے پہلے ان کے ذریعہ مستقبل میں تاریخ کے عمل کی پیشگوئی کی جا سکے۔ اس لئے اس کے کیا فوائد ہیں، اور کیا نقصانات ہیں، ان کے بارے میں حتمی طور پر کچھ نہیں کہا جا سکتا ہے۔ ہم اس قدر رائے ضرور دے سکتے ہیں کہ دوسرے علوم کی طرح تاریخ کا علم بھی آگہی اور شعور دیتا ہے، اس کی راہنمائی میں افراد یا قومیں فیصلے کر سکتے ہیں۔

تاریخ کے بارے میں اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ اگر اس کا بغور مطالعہ کیا جائے تو ہم ماضی کی غلطیوں کو نہیں دھرائیں گے۔ یہ بات بھی پوری طرح سے درست نہیں ہے، کیونکہ افراد اور قوموں کا عمل ان کے حالات کی پیداوار ہوتا ہے، وقت کے ساتھ حالات بدل جاتے ہیں، لہٰذا نئے حالات اور ماحول میں فیصلہ کرنا، ان کے مطابق ہوتا ہے۔ تاریخ اس لحاظ سے کوئی ہدایات نامہ نہیں دیتی ہے۔ یہ فیصلہ کرنے کا حوصلہ دیتی ہے۔

لیکن معاشرے کے لئے تاریخ کا علم بے انتہا ضروری ہے۔ کیونکہ جرمن مفکرین کے نزدیک معاشرے کے مسائل کو اس وقت تک نہیں سمجھا جا سکتا ہے، جب تک کہ اس کی تاریخی جڑوں تک نہیں جایا جائے۔ کیونکہ کوئی بھی مسئلہ اچانک خلا میں پیدا نہیں ہوتا ہے۔ اس کے پس منظر میں پورا تاریخی عمل ہوتا ہے۔ اس وجہ سے تاریخ معاشرے کی ساخت، اس کی ہیئت، اس کے رویوں، روایات اور اقدار کو سمجھنے میں مدد دیتی ہے۔

مثلاً ہم معاشرے کی موجودہ شکل اور اس کی روایات کو نیچرل اور فطری سمجھ لیتے ہیں۔ اگر معاشرے میں ذات پات کی تقسیم ہے، امیر و غریب کا فرق ہے، تو یہ کہا جاتا ہے کہ یہ فطری ہے،

اسی طرح سے عورتوں کا سماجی درجہ اکثر مردوں کے مقابلہ میں گرا ہوا اور پس ماندہ ہے تو یہ دلیل دی جاتی ہے کہ یہ فطری ہے۔ لیکن اگر تاریخ کے ذریعہ ان عوامل کا مطالعہ کریں تو یہ واضح ہو کر ہمارے سامنے آئے گا کہ یہ سب فطری یا نیچرل نہیں ہے بلکہ تاریخی عمل کا نتیجہ ہے، اور جب ہم اس کو تاریخی عمل کا نتیجہ تسلیم کر لیں گے تو پھر اس کو تبدیل کرنے پر بھی تیار ہو جائیں گے، کیونکہ ہمیں اس کا احساس ہوگا کہ یہ ناانصافی اور ظلم ہے، جو معاشرے کی ترقی کی راہ میں رکاوٹ بنا ہوا ہے۔

اس نقطۂ نظر سے اگر ہم نجی جائیداد کے ادارے، جاگیرداری کے نظام، پیروں اور روحانی مرشدوں کی برتری اور عام لوگوں کی مفلسی، بے بسی، اور ابتری کو تاریخ کے تناظر میں دیکھیں گے تو اس کا حل نظر آئے گا۔

تاریخ اس امر کو بھی ثابت کرتی ہے کہ انسان ظلم و استحصال کو برداشت نہیں کرتا ہے اور اس کے خلاف بغاوت کرتا ہے، مزاحمت کرتا ہے، اور انصاف کی خاطر جدوجہد کرتے ہوئے اپنی جان تک کی بازی لگا دیتا ہے۔ ہماری موجودہ تاریخ میں ہم دیکھتے ہیں کہ کس طرح جنوبی افریقہ کی اپارتھائڈ حکومت، معہ اپنی تمام قوت و طاقت کے عوام کی مزاحمت کے آگے نہیں ٹھہر سکی اور تبدیلی ہوئی۔ امریکہ میں افریقی غلاموں نے ظلم و استحصال اور نسل پرستی کو برداشت کیا، مگر بالآخر یہ تمام قوانین ان کی مزاحمت کے آگے ختم ہوئے اور انہیں بنیادی حقوق امریکہ کو دینا پڑے۔

اسی طرح جن قوموں نے امپیریل ازم کے خلاف جدوجہد کی، انہوں نے آزادی کی جنگ جیتی۔ یورپی اور امریکی امپیریل ازم کو ان کی ٹیکنالوجی اور فوجی طاقت کے باوجود شکست ہوئی۔ یہ صحیح ہے کہ جدوجہد، مزاحمت اور بغاوت میں لوگوں کو جانوں کی قربانی دینی پڑتی ہے مگر لوگ اپنی قوم اور معاشرے کی خاطر یہ قربانیاں دیتے ہیں۔

دیکھا جائے تو تاریخ انسان کی تخلیقی صلاحیتوں اور ذہانتوں کو ریکارڈ کرتی ہے۔ پتھر کے زمانے سے لے کر موجودہ دور تک انسان برابر تخلیقی عمل میں مصروف ہے۔ یہ عمل معاشرے کو ایک جگہ ٹھہرنے نہیں دیتا ہے، بلکہ اسے برابر متحرک رکھتا ہے۔

لیکن جہاں تاریخ انسان کو حوصلہ دیتی ہے، اسے پُر امید رکھتی ہے، اسے برداشت کا جذبہ دیتی ہے، وہیں تاریخ کے ذریعہ اقوام، اور اشرافیہ اپنے تسلط اور اقتدار کو قائم رکھتے ہیں۔ طاقت ور اقوام اپنی مغربی طاقت کے ذریعہ کمزور اقوام کو اپنا غلام بناتی ہیں، ان کے ذرائع پر قابض ہوتی

ہیں، اورانہیں ذہنی طور پر پس ماندہ بناتی ہیں اس کا سہارا وہ تاریخ سے لیتی ہیں کہ طاقت ورکو کمزور پر حکومت کرنے کا حق ہے۔ یہ نسل پرستی کے ذریعہ اپنی برتری کو ثابت کر کے، کمزور اقوام کو اپنا غلام بناتی ہیں، یا خود کو مہذب ثابت کر کے دوسروں کو غیر مہذب قرار دے کر ان پر حکومت کرتی ہیں۔

برصغیر ہندوستان کی تاریخ نویسی میں ہندو۔ مسلمان تضادات کو ابھارا گیا ہے، دونوں کے پیروؤں کو ایک دوسرے کا مخالف بنا کر ان کی بہادری اور شجاعت کے کارناموں کو بیان کیا گیا ہے۔ یہ تضادات تاریخ کی نصابی کتابوں میں بھی شامل کر لئے گئے ہیں۔ جس کی وجہ سے تاریخ کی یہ نفرتیں دلوں پر نقش ہوگئی ہیں۔

تاریخ کو جب قوم پرستی کے نقطہءنظر سے لکھا جاتا ہے تو دوسری اقوام کو برابر کا درجہ نہیں دیا جاتا ہے، اور قوم کے ہیرو تمام غلطیوں سے پاک وصاف ہو کر سامنے آتے ہیں۔ مثلاً امریکہ میں رونالڈ ریگن کو ایک بڑا مدبر اور زیرک سیاستداں کی حیثیت دی گئی ہے جب کہ اس کے دور صدارت میں نکارا گوا میں امریکی مداخلت نے ان کے انقلاب کو تباہ و برباد کیا۔

انگلستان کی تاریخ میں چرچل کو ایک بڑا سیاستداں بتایا گیا ہے، جب کہ اس کا رویہ ہندوستانیوں کے بارے میں انتہائی نسل پرستی کا تھا۔

اگر چہ روایتی تاریخ کو برابر چیلنج کیا جا تا رہے، مگر ریاست کی سرپرستی میں لکھی جانے والی یہ تاریخ ذرائع ابلاغ کے ذریعہ زیادہ موثر طریقہ سے مشتہر کی جاتی ہے۔

تاریخ کو سیاستداں اور ریاست جب اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرتی ہے تو یہ واقعات کو مسخ کرتا ہے، اور انفارمیشن پر قابو پا کر منحرف مورخوں کو یہ موقع نہیں دیتی کہ وہ اس کے مفادات کو بے نقاب کریں۔

پاکستان میں تاریخ ریاست کے نظریہ اور سیاستدانوں کے مفادات کو پورا کرتی ہے۔ اس وجہ سے اس میں شخصیت پرستی ہے، مذہبی انتہا پسندی ہے دوسرے مذاہب سے نفرت ہے، اور معاشرے میں ہونے والی تبدیلی کی براہ راست مخالفت ہے۔ اس وجہ سے یہ ذہنی طور پر ہماری ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہے۔

ماضی کی واپسی

شاید یہ انسان کی کمزوری ہے کہ وہ جب اپنے حالات سے تنگ آتا ہے، اور اپنے ماحول میں اسے گھٹن محسوس ہوتی ہے تو وہ تاریخ کے اس زمانہ میں واپس جانا چاہتا ہے کہ جب سکون و اطمینان تھا، آبادی کم تھی، لوگ ایک دوسرے سے واقف تھے، گاؤں اور شہر جنگلوں میں گھرے ہوئے تازہ اور خوشگوار ماحول فراہم کرتے تھے۔ ماضی جس قدر دور ہوتا چلا جاتا ہے، اسی قدر وہ سہانا اور دلکش ہو جاتا ہے، اور ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اس عہد میں مسائل کی کمی تھی اور سماجی رشتوں ناطوں میں قربت اور ہم آہنگی تھی۔

لیکن یہ حقیقت ہے کہ مورخ ماضی کی تشکیل، کتابوں میں تو کر سکتے ہیں مگر اسے دوبارہ سے واپس نہیں لا سکتے ہیں، وقت جب گزر جاتا ہے تو وہ پھر پلٹ کر واپس نہیں آتا ہے اس کی یادیں باقی رہ جاتی ہیں۔ اس حقیقت کے باوجود ماہر آثارِ قدیمہ اور مورخوں نے اس بات کی کوشش ضرور کی ہے کہ اگر دوبارہ سے ماضی کو واپس نہ لایا جا سکے، تو کم از کم اس کے کچھ پہلوؤں کو تجرباتی طور پر تشکیل کر کے تجربہ حاصل کیا جائے کہ ماضی میں انسان کن حالات میں رہ رہا تھا، اور اس کے کیا رویئے اور رجحانات تھے؟

چنانچہ اس مقصد کے لئے انگلستان میں لوہے کے زمانہ کا ایک گاؤں تعمیر کیا گیا اور یہاں پر ایک سال تک رضا کاروں کو رہنے کے لئے کہا گیا، کہ وہ اس ماحول اور حالات میں رہیں کہ جو لوہے کے زمانہ میں تھا، اس کا مقصد یہ تھا کہ یہ جائزہ لیا جائے کہ اس ماحول کے انسان کی نفسیات اور اس کی عادات پر کیا اثرات ہوتے ہیں؟ موسموں کی سختیوں میں وہ کس طرح وقت کے ساتھ خود کو تبدیل کرتا ہے۔ انسانی رشتوں کے اثرات کیا ہوتے ہیں؟ اور اس کا برتاؤ دوسروں کے ساتھ کیا ہوتا ہے؟

اس کے ساتھ ہی یہ خواہش بھی پیدا ہوئی کہ ماضی کے اوزار اور ہتھیاروں کے استعمال کو دیکھا جائے۔ اس مقصد کے لئے پتھر کے اوزاروں کا انتخاب کیا گیا، اور یہ تجزیہ کیا گیا کہ ان کی تیز دھار سے گوشت کو کس قدر سہولت سے کاٹا جا سکتا ہے۔ اس بات کا بھی تجزیہ کیا گیا کہ جدید آپریشن میں ان پتھروں کے اوزاروں کو جو کہ بہت تیز دھار رکھتے ہیں، استعمال کیا جائے۔

کچھ لوگوں نے زراعتی معاشرے کو سمجھنے کے لئے، ہڈیوں سے درانتی کو بنایا، اور اس کے ذریعہ فصل کو کاٹا، تاکہ یہ اندازہ ہو کہ ابتدائی زراعتی دور میں لوگ ہڈیوں اور پتھروں کے اوزار بنا کر ان کا کیسے استعمال کرتے تھے۔

ماضی میں انسان نے بڑی تہذیبیں پیدا کیں، ان کے آثار اور شواہد سے اندازہ ہوتا ہے کہ انسان کی تخلیقی صلاحیتوں کا اظہار ہر دور اور عہد میں برابر ہوتا رہا ہے۔ تاریخ کا المیہ یہ ہے کہ تہذیبوں کے زوال کے ساتھ، ان کا علم بھی زوال پذیر ہو کر گمنام ہو گیا۔ اس وجہ سے آج کے صاحب علم لوگوں کی کوشش ہے کہ اس کھوئے ہوئے علم کو دوبارہ سے کیسے دریافت کیا جائے؟ اس مقصد کے لئے آج کی سائنس اور ٹیکنالوجی کا سہارا لیا جا رہا ہے۔ مثلاً اب تک یہ ایک راز ہے کہ قدیم مصریوں نے کس طرح سے یہ شاندار اہرام مصر تعمیر کئے؟ اس کی تعمیر میں انہوں نے کون سے طریقوں کو استعمال کیا؟ اس کے بعد یہ مسئلہ بھی ہے کہ انہوں نے ممی کرنے کے فن کو کس طرح سے حاصل کیا، اور لاش کو کن اوزاروں اور آلات کے ذریعہ ممی بنایا گیا۔ لہٰذا کچھ سائنسدانوں نے اس پر تجربہ کیا ہے کہ قدیم مصری آلات کے ذریعہ اس کو آزمایا جائے، اور یہ علم جو وقت کے ساتھ کھو گیا ہے، اسے دوبارہ سے حاصل کیا جائے۔ آج کی جدید تحقیق کے باوجود قدیم تہذیبوں کے بہت سے ایسے راز ہیں کہ جن کے بارے میں حقیقت سامنے نہیں آئی۔ مثلاً یونان سے اولمپک کھیلوں کے جو مجسمے ملے ہیں، ان میں ہائی جمپ کرنے والے ایک مجسمہ میں بتایا گیا ہے کہ وہ جمپ کرتے وقت دونوں ہاتھوں میں کچھ رکھتا تھا۔ اس وقت کے ریکارڈ سے یہ ثابت ہے کہ ہائی جمپ میں ان کا ریکارڈ آج سے زیادہ تھا۔ مگر وہ ہاتھوں میں وزن کیوں رکھتا تھا؟ اس کے بارے میں کچھ پتہ نہیں چل سکا۔

یہاں پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر اس دور کا ترقی یافتہ انسان کہ جس نے سائنس، ٹیکنالوجی، اور دوسرے علوم میں بے انتہا ترقی کر لی ہے، وہ آخر کیوں قدیم علم کی دریافت کرنا

چاہتا ہے؟ کچھ مفکرین کا خیال ہے کہ موجودہ دور کی اس ترقی اور ایجادات کے باوجود اب تک ایسے سماجی، سیاسی اور معاشی مسائل ہیں کہ جن کا حل موجودہ علم کے پاس نہیں ہے، لہٰذا وہ کوشش کر رہے ہیں کہ قدیم علم اور دانشمندی کو دوبارہ سے زندہ کریں اور اس سے سیکھنے کی کوشش کریں، کیونکہ انسان کے ذہن کو سمجھنے کے لئے چاہے جدید علم ہو یا قدیم وہ مددگار رہوتا ہے۔ اس لئے ماضی کے علم، یا ماضی کی دانش کو یکسر رَد کرنا ضروری نہیں ہے۔ اس کی دریافت میں جو تحقیق ہوگی، اور جس ذہنی صلاحیت کا استعمال کیا جائے گا، اس سے انسانی تہذیب میں اضافہ ہوگا، اور ہمیں تاریخ کے تسلسل کو سمجھنے میں مدد ملے گی۔

تاریخ کا عمل

یورپ کے مورخوں نے اپنی تاریخ کا گہرائی کے ساتھ مطالعہ کیا ہے اور تاریخی ماخذوں کی مدد سے تحقیق کے بعد اس کی تشکیل کی ہے۔ انہوں نے تاریخ کے عمل کو مختلف ادوار میں تقسیم کیا ہے تا کہ اس کی مدد سے تبدیلی کے عمل کو سمجھا جا سکے۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے تاریخی اصطلاحات کو استعمال کیا ہے، جو یورپ کی تاریخ کو سمجھنے میں مدد دیتی ہیں۔

ہم اکثر اپنے تاریخی عمل کو یورپ کی تاریخ نویسی میں دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں، اور اس مقصد کے لئے ان کی اصطلاحات کو بھی استعمال کرتے ہیں۔ اس کی وجہ سے ہمارے لئے یہ مشکل ہو جاتا ہے کہ ہم اپنے تاریخی عمل کو، یورپ کے تاریخی عمل کی روشنی میں سمجھ سکیں کیونکہ ہمارا تاریخی عمل اس سے مختلف ہے، ہمارے تاریخی ادوار کی خصوصیات اس سے علیحدہ ہیں لہٰذا ہمیں اپنی تاریخ کو، اپنے تاریخی ماخذوں کے حوالے سے اور اس عمل کے دوران جو تبدیلیاں آئی ہیں، اس کی روشنی میں مطالعہ کی ضرورت ہے۔ جب زراعتی معاشرہ قائم ہوا ہے اور آپس کی جنگوں کے نتیجہ میں مثلاً یورپ کی تاریخ میں غلامی کا رواج ہوا ہے، اس نے یونانی شہری ریاستوں، اور رومی سلطنت میں عروج حاصل کر لیا تھا۔ زراعتی معاشرے میں غلام پیداوار کی مشین کی مانند تھا، جس سے بیگار کے طور پر کام لیا جاتا تھا، اس لئے کوشش کی جاتی تھی کہ زیادہ سے زیادہ غلاموں کو حاصل کیا جائے، جو کھیتوں میں، معدنیات کی کانوں میں، اور گھریلو کاموں میں اہم خدمات سرانجام دیتے تھے۔ لیکن ہندوستان میں غلامی اس شکل میں کبھی نہیں آئی۔ یہاں غلامی کے بجائے ذات پات میں معاشرہ کو تقسیم کر رکھا تھا، اور نچلی ذات کے لوگ محنت کے کام کرتے تھے۔ یہ نظام اس قدر سخت تھا کہ اس کے خلاف کسی قسم کی بغاوت ممکن ہی نہیں تھی جب کہ غلامی کے معاشرے میں غلاموں کی بغاوتیں ہوتی رہی ہیں۔ جس کی وجہ سے یونانی اور رومی دونوں معاشرے غلاموں کی

بڑھتی ہوئی تعداد سے خوف زدہ رہنے لگے تھے اور بغاوتوں کی روک تھام کے لئے انتہائی سخت سزائیں مقرر کر رکھی تھیں۔ جب کہ ہندوستان میں ذات پات کی مذہبی تقسیم کی وجہ سے معاشرے میں کوئی بے اطمینانی اور شورش نہیں ہوئی، ہر ذات کا فرد اپنے کام کو دھرم سمجھ کر پورا کرتا رہا۔

یورپ کا فیوڈل نظام بھی ہم سے جداگانہ تھا۔ یہاں فیوڈل لارڈ فوجی طاقت اور قوت کا مالک ہوتا تھا اور بادشاہ کے اختیارات کو چیلنج کرتا تھا۔ مثلاً برطانیہ میں پارلیمنٹ کا ادارہ فیوڈل لارڈ پر مشتمل تھا، اور یہ بادشاہ کو مطلق العنان نہیں ہونے دیتے تھے، اسی وجہ سے جب انگلستان کے بادشاہ جان (John) نے ٹیکس لگانا چاہا تو فیوڈل لارڈز نے انکار کر دیا کہ ان کی مرضی کے بغیر وہ نئے ٹیکس لگانے کا حق نہیں رکھتا ہے، اور انہوں نے میگناکارٹا کے ذریعہ پارلیمنٹ سے زیادہ سے زیادہ اختیارات حاصل کئے اور یہ سلسلہ چلتا رہا، جس کے نتیجہ میں پارلیمنٹ بااختیار ہوتی چلی گئی۔ یہی صورت حال یورپ کے دوسرے ملکوں میں تھی کہ جہاں فیوڈل لارڈ حکمراں کے اختیارات کو محدود رکھے ہوئے تھے۔

ہندوستان میں جاگیردار طبقہ بادشاہ کا ملازم ہوتا تھا۔ جاگیر اسے تنخواہ کے عوض ملتی تھی، جو موروثی نہیں ہوتی تھی، اس کے مرنے یا ریٹائرمنٹ کے بعد یہ بادشاہ کے پاس چلی جاتی تھی۔ اس لئے جاگیردار نہ تو طاقت ور تھا اور نہ بااختیار کہ وہ حکمراں کے اقتدار کو چیلنج کر سکے، اس لئے بادشاہ مطلق العنان ہوتا تھا اور اس کے اختیارات اور طاقت کو محدود کرنے والا کوئی ادارہ نہیں تھا۔ لہٰذا یورپ کے فیوڈل نظام اور ہمارے جاگیردارانہ نظام میں زبردست فرق تھا۔

یورپ میں بورژوا طبقہ کا ابھار صنعتی انقلاب کے بعد آیا، جب سرمایہ دارانہ نظام کی ابتداء ہوئی، اور اس کے ساتھ ہی فیکٹریوں میں کام کرنے والا مزدوروں کا طبقہ وجود میں آیا۔ بورژوا طبقہ کے پاس جب دولت آئی، اور ساتھ ہی میں اس طبقہ میں پیشہ ور ڈاکٹر، انجینئر، استاد اور تاجروں کا طبقہ اہم ہوا تو انہوں نے متحد ہو کر یہ مطالبہ کیا کہ ملک کی سیاست میں انہیں بھی شریک کرنا چاہئے، اور اس نظام میں اب تک جو امراء کا قبضہ ہے اسے ختم ہونا چاہئے۔ اس کے نتیجہ میں انگلستان میں اصلاحات کے ذریعہ بورژوا طبقہ کو سیاسی حقوق ملے، جب کہ فرانس میں 1789 میں انقلاب نے سیاسی نظام کو تبدیل کیا۔ یورپ کا بورژوا طبقہ نہ صرف تعلیم یافتہ تھا، بلکہ اس میں جدت پسندی بھی تھی، مہم جوئی بھی تھی، اور ذہانت و تخلیقی صلاحیتیں بھی تھیں۔ اس لئے کارل مارکس نے کمیونسٹ مینی

فیسٹو میں بورژوا طبقہ کی بڑی تعریف کی ہے کہ اس نے اپنی جدت پسندی اور ذہانت سے تیزی سے دنیا کو بدل ڈالا۔

پاکستان میں چونکہ کوئی صنعتی انقلاب نہیں آیا، اس لئے یہاں بورژوا طبقہ، اگر اسے یہ نام بھی دے دیا جائے تو یہ یورپ کے مقابلہ میں بالکل مختلف ہے۔ یہ طبقہ کچھ تو اس صنعتی عمل کے ذریعہ وجود میں آیا کہ جو غیر ملکی سرمایہ دارانہ نظام اور کارپوریٹ سرمایہ کے ایجنٹ کے طور پر اُبھرا۔ ان میں اب وہ لوگ بھی شامل ہو گئے ہیں کہ جنہوں نے ڈرگ اسمگلنگ، اور زمینوں پر قبضہ کر کے دولت اکٹھی کی اور اب اسے صنعتوں میں لگا دیا ہے۔ چونکہ یہ طبقہ بدعنوانیوں اور کرپشن کے نتیجہ میں پیدا ہوا ہے، اس لئے ان میں معاشرے کو تعمیر کرنے کا کوئی جذبہ نہیں ہے۔ اس کے علاوہ یہ طبقہ نہ تو جدید تعلیم سے آراستہ ہے، اور نہ نئے نظریات وخیالات آگہی رکھتا ہے، اور نہ ہی اس میں یہ جذبہ ہے کہ وہ پرانے نظام کو توڑ کر، نئے نظام کی تشکیل نو کر سکے۔ اس لئے ہمارا بورژوا طبقہ قدیم نظام، اور فرسودہ اداروں اور روایات کے سہارے اقتدار میں آ کر حکومت کرنا چاہتا ہے۔

اس وجہ سے ہمارے دانشوروں کو جو خوش فہمی ہے، اسے دور ہونا چاہئے کہ پاکستانی بورژوا طبقہ منافقت اور موقع پرستی کی علامت ہے، اس میں نہ تو تبدیلی کی کوئی خواہش ہے، اور نہ ہی نئے ادارے اور روایت کی تعمیر کی صلاحیت ہے۔

قانون کی بالادستی

جب لوگوں نے قبیلوں اور برادریوں میں رہنا شروع کیا، تو یہ ضروری تھا کہ آپس میں مل جل کر رہنے، روابط اور سماجی و معاشی رشتوں کے لئے رسم و رواج اور قواعد کا پابند کیا جائے تاکہ ہر شخص اپنے طور سے ذاتی مفادات کے لئے کام نہ کرے، بلکہ قبیلہ یا برادری کے مفادات کا خیال رکھے۔ اس مقصد کے لئے ہر قبیلہ اور برادری نے اپنے رسم و رواج کی ابتداء کی، جس کی پابندی اس کے ہر فرد پر لازمی تھی۔ اگر کوئی ان کی خلاف ورزی کرتا تھا تو اس کے لئے سزائیں تھیں، جن میں سے ایک سزا یہ بھی تھی کہ اسے ذات یا برادری سے خارج کر دیا جاتا تھا، جس کی وجہ سے وہ فرد غیر محفوظ ہو جاتا تھا، اس لئے کوئی بھی ان رسم و رواج کے خلاف جانا نہیں چاہتا تھا۔

جب قبیلے اور برادریاں اکٹھی ہوئیں اور ایک ریاست کی تشکیل ہوئی تو اب ریاست کی جانب سے قوانین بنائے گئے تاکہ لوگ ان روایات کے ساتھ رہیں اور معاشرے میں انتشار اور بے چینی کا باعث نہ بنیں۔

مگر ریاست کی تشکیل کے ساتھ ہی طاقت ور حکمراں طبقوں کا وجود آیا کہ جو صاحب اقتدار تھے۔ اس لئے قوانین میں اس بات کا خیال رکھا گیا کہ ان کے اور عام لوگوں کے درمیان فرق اور امتیاز کو قائم کیا جائے۔ اس لئے یہ طاقت ور طبقے قانون کی اہم ذمہ داریوں سے آزاد تھے۔ سزاؤں میں بھی ان کے ساتھ امتیازی رویہ روا رکھا جاتا تھا۔ خاص طور سے بادشاہ یا حکمران قانون کی زد سے آزاد ہوتا تھا، بلکہ اس کا ہر حکم اور ہر فرمان قانون ہوتا تھا، جس کی پابندی اس کی رعیت پر لازم تھی۔ مطلق العنان بادشاہتوں میں، جن میں قدیم مصر یا چین کی ریاستیں قابل ذکر ہیں، وہاں بادشاہ کی شخصیت الوہی تھی، اور وہ قانون سے بالاتر تھا۔ میسوپوٹامیہ یا جدید عراق میں جب بابل کی سلطنت کا حکمراں حمورابی ہوا، تو اس نے پہلی مرتبہ اپنی ریاست میں ایک مضبوط اور جامع قوانین

کا نفاذ کیا، جس میں تجارتی، سماجی اور سیاسی تعلقات آتے تھے۔ اس قانون کا بنیادی اصول تھا کہ دانت کے بدلے دانت اور آنکھ کے بدلے آنکھ، یعنی اگر کسی نے کسی لڑکی یا لڑکے کو قتل کیا ہے تو اس کے بدلے میں اس کی لڑکی یا لڑکے کو قتل کیا جاتا تھا۔ اگر ڈاکٹر کے غلط آپریشن سے مریض کو نقصان ہوتا تھا تو اس کے ہاتھ کاٹ دیئے جاتے تھے، وغیرہ۔ اس قانون کی ایک اہمیت یہ تھی کہ یہ حمورابی کو دیوتا مردوک کی جانب سے دیا گیا تھا، اس لئے وہ خود بھی قانون کی زد میں آتا تھا اور دوسرے حکمرانوں کی طرح اس سے بالاتر نہیں تھا، چونکہ یہ قانون دیوتا کی جانب سے تھا اس لئے اس میں کوئی ردوبدل نہیں ہوسکتا تھا۔

قانون کی دوسری شکل قدیم یونان کی ریاست ایتھنز میں ہوئی۔ پہلے ڈریکو (Draco) نامی شخص نے قوانین تیار کئے جن میں سخت سزائیں تجویز کی گئیں تھیں۔ کیونکہ خیال یہ تھا کہ انسان ڈر اور خوف سے جرائم کا ارتکاب نہیں کرے گا اور قانون کی پابندی کرے گا۔ مگر ان سخت سزاؤں کے باوجود معاشرے میں جرائم جاری رہے۔ اس کے بعد سولن (Solan) نے قوانین کا اجراء کیا۔ ان قوانین کی خاص بات یہ تھی کہ اب ملزم پر مقدمہ دائر کیا جاتا تھا۔ اس مقدمہ کو جج اور جیوری کے ذریعہ سنا جاتا تھا۔ ملزم کو یہ حق تھا کہ وہ یا تو خود اپنا دفاع کرے یا کسی وکیل کے ذریعہ اپنا موقف پیش کرے۔ اس میں عدالت کے فیصلہ کو چیلنج کیا جاسکتا تھا، اور مقدمہ میں اپیل کی جاسکتی تھی۔ شہریوں کو قانون سے واقف رکھنے کی خاطر، انہیں کندہ کرا کے شہر کے چوک میں رکھ دیا گیا تھا تاکہ ہر شخص ان کو پڑھ کر قانون سے واقف ہو۔

رومیوں نے ایک جامع قانون کی تشکیل کی، اس کی وجہ یہ تھی کہ ایتھنز کی ریاست ایک شہری ریاست تھی، جب کہ رومیوں نے ایک بڑی امپائر کی بنیاد ڈالی کہ جس میں کئی اقوام شامل تھیں۔ اس لئے امپائر میں امن وامان، اور اسے منظم رکھنے کے لئے ضروری تھا کہ ہر شعبہ میں قوانین کو روشناس کرایا جائے۔ لہٰذا تجارت، سماجی معاملات، سیاسی مسائل، ان سب کے لئے قانون بنائے گئے۔ مقدموں کا فیصلہ عدالت میں جج کیا کرتے تھے۔ ملزم کو پورا حق تھا کہ وہ اپنا دفاع کر سکے۔

یونان اور روم کے یہ قوانین اس عہد میں تشکیل ہوئے کہ جب معاشرے میں پدرسری یا مرد کا تسلط قائم ہو چکا تھا اور عورتیں مرد کے ماتحت تھیں، اس لئے ان میں مردوں کو زیادہ مراعات دی گئی ہیں، اور عورتوں کو ان کے بنیادی حقوق سے محروم رکھا گیا ہے۔ دوسرے ان قوانین میں نجی

جائیداد کی اہمیت کو محسوس کرتے ہوئے، اس کو پورا پورا تحفظ دیا گیا ہے۔

رومی قوانین یورپ میں عہد وسطیٰ میں بھی رائج رہے، اور بعد میں بھی ان میں سے بعض قوانین کو یورپ کی ریاستوں میں نافذ رکھا گیا۔

انگلستان میں قانون کی تشکیل دوسرے انداز سے ہوئی۔ جب 1096ء میں ولیم فاتح نے انگلستان کو فتح کیا تو اس نے زمین کی جائیدادوں کا سروے کرایا، جو ڈومس ڈے بک (Doomsday book) نامی کتاب میں اندراج ہوا۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ ان زمینداروں کو اپنے تسلط میں لایا جائے۔ اس کے بعد اس نے عدالت کے عہدے داروں کو ان جائیدادوں کے جھگڑوں کے فیصلہ کے لئے متعین کیا۔ انہوں نے جو فیصلے دیئے وہ اب کامن لاء کہلاتے ہیں۔ جو انگلستان کا قانون ہے، اور وہ ان فیصلوں پر مبنی ہے جو ججوں نے کئے تھے۔ انگلستان کے قانون میں دوسری اہم تبدیلی اس وقت آئی کہ جب اس کے حکمران جان (John) نے فیوڈل لارڈ سے نئے ٹیکس کا مطالبہ کیا۔ انہوں نے یہ ٹیکس اس شرط پر دینا منظور کیا کہ وہ اس کے عوض انہیں کچھ حقوق دے۔ یہ قانون میگنا کارٹا کے نام سے پارلیمنٹ نے 1250ء میں پاس کیا۔ اس عہدنامہ کے ذریعہ بادشاہ بغیر پارلیمنٹ کے کوئی ٹیکس لگانے کا مجاز نہیں تھا۔ اس کے علاوہ جیوری کے ذریعہ مقدمہ کا فیصلہ، کسی کا جرم ثابت ہونے تک حبس بے جا میں نہ رکھنا اور نجی جائیداد کا تحفظ شامل تھا۔ اس قانون نے بادشاہ کو ایک حد تک پارلیمنٹ کا ماتحت کر دیا۔ بادشاہ کی طاقت اس وقت اور کمزور ہوئی جب 1688ء میں شاندار انقلاب کے ذریعہ بادشاہ کو عدالتی معاملات میں دخل اندازی سے روک دیا۔ بل آف رائٹس (Bill of Rights) کے ذریعہ بادشاہ پارلیمنٹ کے ماتحت ہوگیا۔

یورپ کے دوسرے ملکوں میں فرانسیسی انقلاب 1689ء نے انقلابی تبدیلی کی۔ اس کے بعد 1830ء اور 1848ء کے انقلابوں نے یورپ کے ملکوں میں دستوری بادشاہت کا نفاذ کیا۔ دساتیر کے عمل نے ان کے معاشرے میں قانون کی بالادستی کو قائم کیا، اور اب تک حکمراں اور اشرافیہ جو قانون سے بالاتر تھے، ان کی یہ حیثیت ختم ہوگئی اور وہ ہر شہری کی طرح قانون کی زد میں آ گئے۔

لہٰذا اس وقت یورپ اور امریکہ میں قانون کی بالادستی ہے، اور اس میں امیر و غریب یا صاحب اقتدار اور اس کے عہدے کو نہیں دیکھا جاتا ہے۔ قانون کی نظروں میں سب برابر ہیں،

اس وجہ سے وہاں کے عوام اپنے حقوق کے لئے قانون کا سہارا لیتے ہیں، اور عدالت سے انصاف طلب کرتے ہیں۔ اشرافیہ کے پاس یہ مراعات نہیں ہے کہ وہ قانون کو اپنی ذات کے لئے استعمال کر کے اپنے مفادات کا تحفظ کرے۔

جب انگریز برصغیر ہندوستان میں آئے تو اپنے ساتھ برطانوی قانون اور عدالتی نظام کو بھی لے کر آئے۔ اس قانون کے تحت وکیلوں کا طبقہ ابھرا جو کہ مقدمات کی پیروی کرتا تھا۔ فیصلہ کے خلاف اپیل کا بھی حق تھا، مگر اس کے ساتھ ہی برطانوی حکومت نے اپنے تحفظ اور مراعات کے لئے قانون میں گنجائش رکھ رکھی تھی۔ ابتداء میں کوئی انگریز یا یورپی ہندوستانی جج کے سامنے بطور ملزم نہیں جاتا تھا۔ اس پر یورپی جج ہی مقدمہ چلا کر فیصلہ کر سکتا تھا۔ اس کے علاوہ انہوں نے وقتاً فوقتاً ایسے قوانین نافذ کئے کہ جنہوں نے بنیادی انسان حقوق کی پامالی کی۔ پہلی جنگ کے بعد رولٹ ایکٹ مشہور بدنام زمانہ قانون تھا کہ جس میں کسی کو بھی بغیر مقدمہ چلائے گرفتار کیا جا سکتا تھا۔

آزادی کے بعد یہ برطانوی قانون ہماری میراث میں آئے۔ پاکستان میں چونکہ جاگیردار اور قبائلی سردار مضبوط تھے، اس لئے انہوں نے ریاست کے قوانین کی پرواہ نہیں کی۔ ان کے نزدیک قانون کی خلاف ورزی کر کے اپنی برتری کو ثابت کرنا تھا۔ اسی طرح نوکر شاہی اور فوج کے اعلیٰ عہدے دار بھی خود کو قانون سے بالاتر سمجھتے ہیں، اور قانون کی پابندی عام لوگوں تک محدود رکھنا چاہتے ہیں، قانون کی خلاف ورزی اور اس کی بالادستی کے خاتمہ کی صورت میں معاشرے میں انصاف کی کوئی قدر و قیمت نہیں رہی ہے۔ قانون کے ذریعہ عوام اور کمزور لوگوں کو ہراساں اور پریشان کیا جاتا ہے۔

قانون کے اس استعمال کی وجہ سے معاشرے میں اس کا احترام ختم ہو گیا ہے، اور ہر فرد کو جب بھی موقع ملتا ہے وہ اس کی خلاف ورزی کرتا ہے، اس کے نتیجہ میں معاشرہ انتشار اور افراتفری کا شکار ہے۔

قانون کی مزاحمت

قانون کے بارے میں یہ تاثر دیا جاتا ہے کہ یہ ایک مقدس لائحہ عمل ہے، جس کی پابندی کرنا لازمی ہے۔ لیکن قانون کی تشکیل میں حکمراں، اور با اقتدار طبقوں کے مفادات شامل ہوتے ہیں جو اس کے ذریعہ اپنی جائیداد، اور مراعات کا تحفظ چاہتے ہیں۔ اس لئے قانون کی شقوں اور ان کی روح کو سمجھنا ضروری ہے کہ ان کے کیا مقاصد ہیں، اور کس حد تک یہ سماج کے کن طبقوں کی خواہشات کو پورا کرتے ہیں؟

قانون سماج کے مختلف شعبوں اور پہلوؤں کا احاطہ کرتا ہے، جن میں معاشی، سیاسی، مذہبی، اور سماجی قابل ذکر ہیں۔ مذہبی قوانین کی اہمیت یہ ہوتی ہے کہ ان کی اتھارٹی دیوتاؤں سے منسوب ہوتی ہے، اس لئے لوگوں کے لئے یہ لازمی ہو جاتا ہے کہ ان پر عمل کریں، کیونکہ خلاف ورزی کی صورت میں دیوتاؤں یا الٰہی قوتوں کی ناراضگی کا خطرہ ہوتا ہے اس وجہ سے ان قوانین کو بدلنا، یا ان میں ترمیم کرنا مشکل ہوتا ہے۔ مثلاً ہندوؤں میں ذات پات کے قوانین کو منوشاستر میں تفصیل سے بیان کیا گیا ہے۔ ان قوانین کی مذہبی حیثیت یہ ہے کہ جو فرد جس ذات میں پیدا ہو گیا، اب اس کا مقدر ہے کہ وہ کسی ذات میں رہے گا۔ اسے تبدیل کرنے کا حق اس کو نہیں ہوتا ہے۔ یہ قانون جاتی کہلاتا ہے۔ جو نچلی ذات میں پیدا ہوئے، یا اچھوت طبقہ میں پیدا ہوئے، ان پر مذہبی طور پر یہ فرض ہے کہ اس کی پابندی کریں تا کہ اگلے جنم میں وہ اعلیٰ ذات میں پیدا ہو سکیں۔ اس قانون نے خاص طور سے برہمن طبقہ کو برتری اور افضلیت دیدی، اور نچلی ذات والوں کے لئے نجات کا کوئی راستہ نہیں رہا۔ اس کے خلاف مزاحمت بھی نہیں ہو سکتی، کیونکہ یہ مذہب کا قانون ہے۔ مخالفت کا مطلب ہے کہ نجات کے تمام راستے بند ہو جائیں گے۔ اس لئے اگر انہیں ہندو دھرم میں رہنا ہے تو ان قوانین کی پابندی لازمی ہے۔

ہندوستان میں ذات پات کی بنیاد پر قانون کا اطلاق مختلف ہوتا تھا۔ اعلیٰ ذات کے لوگ بہت سی مراعات کے حامل تھے۔ ایک ہی جیسے جرم پر ان کو کم سزا ملتی تھی، جب کہ نچلی ذات کے لوگوں کو زیادہ سزا یا جرمانہ ادا کرنا ہوتا تھا۔ کوٹلیہ نے اپنی کتاب ارتھ شاستر میں جرائم کی بنیاد پر جو جرمانے اعلیٰ اور ادنیٰ ذات کے لوگوں کو دینا ہوتے تھے، اس کی تفصیل دی ہے۔

دوسرے معاشروں میں امراء کا طبقہ قانون کی بہت سی پابندیوں سے آزاد تھا، جب کہ عام لوگوں کو معمولی جرائم پر سخت سزائیں دی جاتی تھیں۔ سخت سزاؤں کے پس منظر میں جو ذہنیت کام کر رہی تھی، وہ یہ تھی کہ چونکہ قانون کی بنیاد ناانصافی پر ہے، اس لئے عام لوگ اس کی پابندی سے گریز کرتے تھے اور مزاحمت کے ذریعہ اس کی خلاف ورزی کرتے تھے۔ اس وجہ سے قانون کو باقی رکھنے کے لئے حکمراں طبقوں کو سخت سزاؤں کی ضرورت پڑی۔

ناانصافی کی بنیاد پر بنائے ہوئے قوانین کی خلاف ورزی ضروری ہوتی ہے کیونکہ یہ قوانین عام لوگوں کی آزادی، ان کی ذہانت، ان کی تخلیقی صلاحیتوں کو روکتے ہیں اور معاشرے میں مراعات یافتہ طبقہ کی اجارہ داری قائم کر کے اس کی ترقی میں رکاوٹ ہوتے ہیں۔ اس لئے سخت سزاؤں، اور قید و بند کی سختیوں کے باوجود عام لوگ ان قوانین کی مزاحمت کرتے رہے ہیں اور اپنے حقوق کے حصول میں کامیاب بھی ہوئے ہیں۔

ہمارے سامنے جنوبی افریقہ کی اپارتھائڈ حکومت اور سوسائٹی کی مثال موجود ہے کہ جہاں گوروں کو ہندوستانیوں اور مقامی افریقی لوگوں پر رنگ اور نسل کی بنیاد پر برتری تھی، یہ گورے یا یورپین، وہاں حملہ آور ہوئے تھے اور اس ملک پر قبضہ کر کے اپنی حکومت قائم کی تھی، جس کی بنیاد فوجی طاقت و قوت پر تھی۔ انہوں نے افریقیوں کو انہی کے ملک میں کم تر درجہ پر رکھ کر ان سے محنت و مزدوری کرائی اور اپنے لئے آرام و عیش حاصل کیا۔ اپارتھائڈ کے قوانین اس حد تک انسانی اور غیر انسانی رویہ پر بنائے گئے تھے کہ جو حساس ذہن کو حیرت زدہ کر دیتے تھے۔ مثلاً گوروں اور کالوں کے لئے باغوں، پوسٹ آفس، ریلوے اور پبلک جگہوں پر علیحدہ علیحدہ سیٹیں اور کھڑکیاں تھیں۔ وہ ریل میں گوروں کے ڈبہ میں سفر نہیں کر سکتے تھے۔ شہر میں جہاں گورے رہتے تھے، وہاں انہیں آنے کی اجازت نہیں تھی، ان کی بستیاں علیحدہ تھیں، ملازمتوں میں وہ حکومت کے اعلیٰ عہدے حاصل نہیں کر سکتے تھے۔ یہ سب کچھ قانون کے ذریعہ تھا کہ جس پر پابندی لازمی تھی۔

اس لئے عام لوگ ان قوانین کوتسلیم کرنے پر تیار نہ تھے، انہیں سختی کے ساتھ نافذ کیا گیا تھا۔ جب افریقی نیشنل کونسل، جس کا سربراہ نیلسن منڈیلا تھا اس نے اس کی مزاحمت کی تو قانون کی خلاف ورزی پر انہیں سزادی گئی۔ جولوگ سزایافتہ تھے انہوں نے 27 سال قید میں گزارے۔

دلچسپ بات یہ تھی کہ قید خانے میں بھی نسلی بنیاد پر قوانین تھے، مثلاً گوروں کو علیحدہ جیل میں رکھا جاتا تھا، ان کا یونیفارم، اور کھانا مقابلتاً بہتر ہوتا تھا۔ اس کے بعد وہاں کے رہنے والے ہندوستانی تھے، جواس نسلی نظام میں گوروں کے بعد دوسرے نمبر پر آتے تھے، اور پھر کالے افریقی تھے جن کا یونیفارم اور کھانا کم حیثیت کا ہوتا تھا۔

لیکن اپارتھائڈ کے یہ قوانین، اوراس کی حکومت مستقل طور پر نہیں رہ سکی۔ مزاحمت کی تحریک کے نتیجہ میں بالآخراسے ان قوانین کوختم کر کے اقتدار جمہوری نظام کے تحت کالوں کومنتقل کرنا پڑا۔

نسل پرستی کی بنیاد پر اس قسم کے قوانین امریکہ میں بھی رائج تھے، برطانوی حکومت سے آزاد ہونے، امریکہ کو جمہوریہ قرار دینے، اور آزادی کے اعلان کے باوجود وہاں کالے لوگوں کے ساتھ تعصب برقرار رہا۔ اگرچہ خانہ جنگی کے نتیجہ میں غلامی کا ادارہ تو ختم ہوگیا، مگر ان کا نسلی تعصب برقرار رہا، خصوصیت سے امریکہ کے جنوبی علاقوں میں وہ قوانین موجود تھے کہ جن کی بنیاد پر یہ ہوٹلوں میں، تعلیمی اداروں میں اور پبلک جگہوں پر گوروں کے ساتھ کالے شریک نہیں ہو سکتے تھے۔ بسوں میں ان کے لئے آخری نشستیں ہوتی تھیں۔ علیحدگی کے یہ قوانین انتہائی سخت تھے اور ان پر پابندی لازمی تھی۔

لیکن 1960ء کی دہائی میں ان قوانین کے خلاف اس وقت آواز اٹھی، جب روزا پارک نے بس میں گوروں کی نشست سے اٹھنے سے انکار کر دیا۔ اس نے امریکہ کے جنوبی علاقوں میں کالوں کی مہم کا آغاز کیا، اس مہم کے دوران مارٹن لوتھر کنگ ایک راہنما کے طور پر ابھرا، اور پورے ملک میں تحریک نے اس قدر زور پکڑا کہ ان قوانین کا خاتمہ کرنا پڑا۔

ہندوستان میں قانون کی خلاف ورزی کی مثال گاندھی جی کا وہ مشہور مارچ ہے کہ جب انہوں نے گجرات میں سمندر پر جا کر وہاں نمک بنایا، کیونکہ برطانوی حکومت نے نمک بنانے اور اس کی تجارت پر اپنی اجارہ داری قائم کر رکھی تھی، جس کی وجہ سے عام لوگوں کو یہ مہنگا خریدنا پڑتا تھا۔ اس لئے جب برطانوی حکومت کے خلاف تحریک چل رہی تھی تو اس کا ایک پہلو یہ بھی تھا کہ

حکومت کے ان قوانین کی خلاف ورزی کی جائے اور انہیں توڑا جائے جو کہ ناانصافی پر مبنی اور عوام کے مفاد کے خلاف تھے۔

پاکستان میں اب تک کولونیل حکومت کے ایسے قوانین موجود ہیں کہ جو برطانوی دور میں حکومت نے اپنے تحفظ کے لئے بنائے تھے۔ سنسرشپ کے بہت سے قوانین کے ذریعہ آج بھی اخبارات، رسالوں اور ڈراموں پر پابندیاں عائد کی جاتی ہیں، لہٰذا ایسے قوانین کہ جو شہریوں کی آزادی اور ان کے خیالات پر پابندیاں عائد کریں، غیر جمہوری ہیں۔ لیکن ہمارے حکمراں طبقوں نے ان قوانین کو اس لئے باقی رکھ رکھا ہے کہ ان کے ذریعہ وہ اپنے اقتدار کا تحفظ چاہتے ہیں۔ دیکھا جائے تو ہمارا ملک اس وقت مکمل طور پر آزاد ہوگا کہ جب ناانصافی پر مبنی قوانین کا خاتمہ ہوگا۔

وہ قوانین جو لوگوں کے بنیادی حقوق کا تحفظ کرتے ہیں ان کی بالادستی ہونی چاہئے اور وہ قوانین جو بنیادی حقوق کے خلاف ہوں ان کی مزاحمت ہونی چاہئے۔ قانون کا تعلق عوام کی فلاح و بہبود اور معاشرے کے امن سے ہوتا ہے اس لئے قوانین کے اس فرق کو سمجھنا چاہئے۔

اقتدار کا نشہ

تاریخ اس وقت ایک ڈراؤنا خواب بن جاتی ہے جب ہم ان حکمرانوں، بادشاہوں، اور آمروں کے بارے میں پڑھتے ہیں کہ جو قانون سے بالا دست تھے اور بے پناہ اختیارات کے حامل تھے۔ جب کوئی فرد اقتدار پر قابض ہوتا ہے، یا اسے یہ میراث میں مل جاتا ہے، اور اس کے نتیجہ میں وہ جزا اور سزا کے اختیارات حاصل کر لیتا ہے، تو یہ مطلق العنانیت، اس کے کردار اور شخصیت کو بدل دیتی ہے وہ خود کو عام لوگوں سے افضل و برتر سمجھتا ہے، اور قدیم عہد میں تو اسے دیوتا کا درجہ بھی مل جاتا تھا۔ اس برتری کے احساس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ اس کی نظروں میں دوسرے لوگ حقیر، اور کم تر ہو جاتے تھے کہ جن کی زندگی اس کے لئے بے معنی بن جاتی تھی، اس لئے اگر وہ انہیں سزا دیتا تھا، اذیت سے دوچار کرتا تھا، یا قتل کر دیتا تھا تو اس کے لئے یہ کوئی جرم نہیں تھا اور نہ اخلاق اس کی راہ میں حائل ہوتا تھا۔ برتری کے اس احساس کی وجہ سے وہ کسی قسم کی مخالفت یا تنقید گوارا نہیں کرتا تھا، کیونکہ وہ خود کو تمام غلطیوں سے آزاد سمجھتا تھا۔ اس وجہ سے اس کے اردگرد جو مصاحب اور درباری ہوتے تھے وہ خوشامد کے ذریعہ اس کی خوشنودی حاصل کرتے تھے۔ ایسے ماحول میں خوشامد کا فن اپنے عروج پر پہنچ جاتا ہے۔

تاریخ میں قدیم عہد اور عہد وسطٰی کے دوران جب کہ بادشاہتیں اپنے عروج پر تھیں، ہمیں دو قسم کے حکمراں ملتے ہیں، ایک وہ جو کہ اپنی رعایا کے لئے اصلاحات کرتے تھے۔ یہ ان کا اپنی رعیت پر احسان تھا، جس کے لئے اسے بادشاہ کا شکر گزار ہونا پڑتا تھا، دوسرے وہ حکمراں تھے کہ جو اقتدار کے نشہ میں اپنے اختیارات اور طاقت کے ذریعہ لوگوں کو خوفزدہ رکھتے تھے۔ چونکہ ان کے اختیارات پر کوئی پابندی نہیں تھی، اس لئے وہ انہیں ہر طرح سے استعمال کرنے کے لئے آزاد تھے۔

اسیریا اور بابل کے بادشاہوں نے اپنی فتوحات کی یاد میں دیواروں پر جو تصاویر بنوائیں

تھیں، ان میں جنگی قیدی برہنہ حالت میں کھڑے ہیں، میدانِ جنگ میں مرنے والوں کی لاشوں پر سے حکمرانوں کے رتھ گزر رہے ہیں۔ ایک حکمراں نے بطور فخر لکھوایا کہ اس نے جنگی قیدیوں کی کھالیں کھنچوا کر انہیں سزا دی۔

ایران کا بادشاہ کمبےسس (Cymbasis) اپنی دو بہنوں سے شادی کرنا چاہتا تھا، جب اس نے مصاحبوں سے پوچھا کہ کیا یہ قانونی طور پر جائز ہے؟ تو انہوں نے کہا کہ اگرچہ قانوناً یہ ناجائز ہے مگر ایران کا بادشاہ تمام قوانین سے بالاتر ہے، لہٰذا اس نے دونوں سے شادی کر لی۔ ان میں سے ایک بہن کو جو حاملہ تھی، کسی بات پر ناراض ہو کر اس زور سے لات ماری کہ وہ برداشت نہیں کر سکی اور مر گئی۔

اسی کے بارے میں ایک واقعہ ہے کہ لیڈیا کا بادشاہ قارون، جو امیر ہونے کی وجہ سے تاریخ میں مشہور ہے۔ ایک دن کمباسس نے نشے کی حالت میں اپنے دو ملازموں کو حکم دیا کہ اس کو قتل کر دیں۔ ملازموں نے سوچا کہ بادشاہ نے نشہ کی حالت میں یہ حکم دیا ہے، جب نشہ اترے گا تو اسے ضرور اپنے حکم پر شرمندگی ہوگی۔ اس وجہ سے انہوں نے اسے قتل نہیں کیا، ہوا بھی یہی کہ دوسرے دن اس نے قارون کو طلب کیا، جب اسے پوری بات بتائی گئی تو وہ اس پر تو خوش ہوا کہ قارون کو قتل نہیں کیا گیا، مگر ان دو ملازموں کے قتل کا حکم دیا کہ انہوں نے اس کے احکامات کی کیوں تعمیل نہیں کی۔

سکندر نے جب ایران کو فتح کیا تو اس میں رعونت، غرور اور احساسِ برتری پیدا ہو گیا، اور خود کو دیوتا کا درجہ دے کر حکم دیا کہ لوگ درباری اسے ایرانی آداب کے مطابق سجدہ کریں، اس پر اس کے یونانی مصاحبین نے اعتراض کیا۔ ایک بار بھری محفل میں جب اس کے بچپن کے ساتھی نے اس پر تنقید کی اور کہا کہ وہ یہ آداب نہیں بجالائیں گے تو اسے اس قدر غصہ آیا کہ اپنے گارڈ کی تلوار لے کر اسے وہیں قتل کر دیا، اگرچہ بعد میں وہ اپنے اس فعل پر شرمندہ بھی ہوا اور رویا بھی۔

مصر کی ملکہ قلوپطرہ کی یہ تفریح تھی کہ وہ اپنے غلاموں کو سانپوں سے ڈسواتی تھی، اور دیکھتی تھی کہ وہ کتنی اذیت سے، اور کتنے وقت میں جاں بحق ہوتے ہیں۔ اس تجربہ کی بنیاد پر اس نے خود کو ایک سانپ کی قسم جو سیپ (Wasp) کہلاتا تھا اس سے کٹوایا اور فوری طور پر زہر کے اثر سے مر گئی۔

رومی سلطنت کو ریپبلک سے امپائر بنانے میں سیزر کے جانشین اگسٹس کا حصہ ہے۔اس کے بعد اس کے جانشینوں نے جن میں ٹائی بیریس (Tiberius) کیلی گولا (Caligulla) اور نیرو (Nero) تھے انہوں نے اپنے بے پناہ اختیارات کو استعمال کرتے ہوئے قتل و غارت گری، عیاشی اور جنسی بے راہ روی سے پوری امپائر کو بگاڑ کر رکھ دیا۔ ٹائی بیریس نے یہ قانون بنایا کہ شہنشاہ پر تنقید کرنا، یا اعتراض کرنا غداری کے مترادف ہوگا۔اس جرم پر اس نے اپنے مخالفین کو قتل کیا۔ یہی حال کیلی گولا کا تھا، جو ذرا سے شبہ پر لوگوں کو قتل کرا دیتا تھا۔ نیرو کی جانشینی بھی سازش کے ذریعہ ہوئی، اس کی ماں اگروپینا (Agropina) نے دوسری شادی رومی شہنشاہ کالاڈیس (Cladias) سے کی، جو رشتہ میں اس کا چچا تھا پھر اسے کھانے میں زہر دے کر مارا اور نیرو کو شہنشاہ بنوایا۔ نیرو نے برسرِ اقتدار آ کر سب سے پہلے تو اپنے سوتیلے بھائی کو زہر دے کر مارا۔اس کے بعد وہ اپنی ماں کی جان کا دشمن ہوا۔اول اسے زہر دے کر مارنے کی کوشش کی، مگر وہ پہلے سے زہر کا تریاق استعمال کر لیتی تھی، اس لئے زہر اس پر اثر نہیں کرتا تھا۔ دوسری بار اس نے اسے دریا میں ڈبونے کی کوشش کی اور اس کی کشتی کو بیچ دریا میں تڑوا دیا، مگر وہ تیر کر دریا پار کر گئی، اس لئے آخر میں اس نے قاتلوں کو بھیج کر اسے قتل کرایا۔

اس نے اپنے استاد سنیکا (Cenica) جو مشہور فلسفی تھا، حکم دیا کہ وہ خودکشی کر لے، اس نے اس حکم پر خون کی شریان کھول کر جان دیدی۔خود نیرو کا انجام بھی اچھا نہیں ہوا، آخر میں شاہی گارڈ اس سے تنگ آ گئے، اور اس کے قتل کے درپے ہوئے لہٰذا نیرو نے خودکشی کر کے جان دی، اس کے آخری الفاظ تھے کہ دنیا ایک بہترین آرٹسٹ سے محروم ہو رہی ہے۔

ہندوستان کی تاریخ میں سلطان محمد تغلق کے بارے میں ضیاء الدین برنی نے تاریخ ''فیروز شاہی'' میں لکھا ہے کہ وہ مجموعہ اضداد تھا، اگر ایک طرف وہ فیاض اور سخی تھا، دوسری جانب انتہائی ظالم اور بے رحم تھا، وہ لکھتا ہے کہ:

> ''اس کا مسلمانوں کو مروانا، اور سادات، مشائخ، علماء، سنّی اور فرماں بردار اشراف، احرار اور دوسرے طبقوں میں سے لاتعداد لوگوں کو قتل کرانا اس کی جبلت میں تھا۔''

ابن بطوطہ مراکش کا مشہور سیاح تھا، اس نے محمد تغلق کے بارے میں لکھا ہے کہ:

''محل کے پہلے دروازے پر جلاد بیٹھے رہتے ہیں، جب بادشاہ کسی کے مارنے کا حکم دیتا ہے تو وہ محل ہزارستون کے سامنے مارا جاتا ہے۔ لیکن اس کا سر دروازے سے باہر تین دن تک لٹکا رہتا ہے۔ اس کے بارے میں ہے کہ یہ ذراسی بات پر غصہ میں آجاتا تھا اور فوراً قتل کا حکم دیدیتا تھا۔''

منگولوں میں یہ دستور تھا کہ وہ جنگ کے بعد دشمن کی کھوپڑیوں کے مینار بناتے تھے۔ بابر نے بھی پانی پت کی جنگ کے بعد یہ مینار بنایا تھا۔ مگر اس کے جانشینوں نے بعد میں اس روایت کو ترک کر دیا تھا۔

انگلستان میں بادشاہ کے اختیارات، پارلیمنٹ نے ختم کئے، فرانس میں 1789ء کے انقلاب نے بادشاہ کا سر قلم کر کے بادشاہت کا خاتمہ کیا، یورپ کے دوسرے ملکوں میں 1848ء کے انقلاب کے بعد دستوری بادشاہتیں قائم ہوئیں کہ جن میں بادشاہ دستور کے ماتحت ہوگیا۔

ہندوستان میں مغل بادشاہ کے اختیارات اول مرہٹوں کی طاقت نے کم کئے اور ایسٹ انڈیا کمپنی کے اقتدار نے اس کے اختیارات کا خاتمہ کیا۔ 1857ء کی جنگ آزادی کی ناکامی کے بعد مغل خاندان کا خاتمہ ہوگیا۔

موجودہ دور میں جہاں جہاں بادشاہتیں ہیں، اب ان کے اختیارات محدود ہیں مسلمان ملکوں میں اگرچہ بادشاہ کے اختیارات کو روکنے کے ادارے تو نہیں ہیں مگر اب ان کا کردار قدیم یا عہد وسطٰی کے بادشاہوں والا نہیں رہا ہے۔ جمہوری اقدار، روایات اور ماحول نے مطلق العنانیت کو روکنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔

احتجاج اور فسادات

جمہوری نظامِ حکومت کی ایک خصوصیت یہ ہے کہ اس میں لوگوں کو احتجاج کا حق ہوتا ہے۔ اگر لوگ کسی مسئلے یا واقعہ پر ناراض ہیں تو اس کا اظہار وہ احتجاج کے ذریعہ کرتے ہیں۔ یورپ میں اس قسم کا احتجاج ہم نے عراق اور امریکہ کی جنگ کے وقت دیکھا کہ جب لاکھوں لوگ سڑکوں پر آ گئے اور جنگ کے خلاف اپنے جذبات کا اظہار کیا۔ اس قسم کے احتجاج سیاسی، معاشی اور سماجی مسائل پر ہوتے رہتے ہیں۔ ان میں سے اکثر احتجاج اکثریت کی خواہشات کا اظہار کرتے ہیں، اور بعض احتجاج کسی گروہ یا جماعت کے نظریہ کا مظہر ہوتے ہیں، لیکن احتجاج میں لوگ نعروں کے ذریعہ اپنے جذبات کو ظاہر کر کے حکومت، عوام، اور بعض صورتوں میں عالمی دنیا کو پیغام دیدیتے ہیں۔

جب بھی احتجاج ہوتا ہے تو ایک لحاظ سے یہ غصہ کا اظہار ہوتا ہے مگر اس غصہ کو مہذب ملکوں میں پُرامن اور خاموشی سے ظاہر کیا جاتا ہے، جب کہ تیسری دنیا کے اکثر ملکوں میں یہ غصہ فسادات کی شکل میں ظاہر ہوتا ہے، جس میں لوٹ مار، عمارتوں کو آگ لگانا، اور نجی و پبلک جائیداد کو تباہ کرنا شامل ہو جاتا ہے۔ پاکستان میں جب بھی اس قسم کے احتجاج ہوتے ہیں، تو یہ احتجاج پُرامن نہیں رہتے ہیں اور غصہ ایک غضب ناک شکل میں ظاہر ہوتا ہے۔ اس لئے سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس کی کیا وجہ ہے؟ عام طور سے اگر کسی ایک فرد کو غصہ آتا ہے تو کہا جاتا ہے کہ وہ اس پر قابو پائے، اور اپنی بات دلیل اور عقل کی بنیاد پر کرے۔ مگر اکثر افراد اپنی نجی زندگی میں بھی غصہ پر قابو نہیں پاتے ہیں، اس کی مثال گھروں میں تشدد کی ہوتی ہے۔ شوہر بیوی پر تشدد کرتے ہیں، کبھی کبھی یہ صورت حال مار پیٹ سے آگے بڑھ کر قتل تک جا پہنچتی ہے۔ باپ بچوں کو مارتے پیٹتے ہیں، اور مدرسہ اور اسکول میں استاد طالب علموں پر تشدد کرتے ہیں۔ یہ سلسلہ آگے بڑھتا ہے، تو پولیس ملزموں کو اپنے ظلم کا نشانہ بنا کر، کبھی کبھی انہیں زندگی سے محروم کر دیتی ہیں ــــــ خفیہ ایجنسیاں مخالف افراد کو اٹھا

لے جاتی ہیں، اورانہیں اذیت دے کر، ان کو جان سے بھی مار دیتی ہیں، کچھ واقعات میں لوگوں
نے ڈاکوؤں کو پکڑ کرانہیں زندہ جلا دیا ہے، یا کسی ذراسی بات پر مشتعل ہوکر ڈنڈوں اور لاتوں سے
مشتبہ شخص کو مار ڈالا ہے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ تشدد ہمارے معاشرے میں بری طرح سے
سرایت کر چکا ہے، اور لوگ اس کو اپنی ناراضگی اور غصہ کے اظہار کا ایک موثر ذریعہ سمجھتے ہیں۔

یہاں پر ایک سوال یہ بھی آتا ہے کہ آخر لوگوں کو غصہ کیوں آتا ہے؟ پاکستان کے معاشرے
میں اس کی وجہ یہ ہے کہ پورا معاشرہ مراعات یافتہ اور غیر مراعات یافتہ طبقوں میں بٹا ہوا ہے۔ جو
لوگ طاقت ور اور با اختیار ہیں، وہ قانون سے بالاتر ہیں، اور سماج میں ان کے لئے عزت واحترام
ہے۔ ان کے مقابلہ میں بے اختیار اور کمزور طبقے کے لوگ صبح سے شام تک ذلت وخواری سے
دوچار ہوتے ہیں، جب وہ ملازمت کے لئے جاتے ہیں تو افسر یا ان کا مالک انہیں جھڑکیاں دیتا
ہے، برا بھلا کہتا ہے، گالیاں دے کر ان سے مخاطب ہوتا ہے۔

اگر وہ کسی کام سے آفسوں میں جاتا ہے تو کلرک اس کے چکر لگواتے ہیں، کام کے عوض
رشوت طلب کرتے ہیں۔ اگر اسے کسی سفارش کی ضرورت ہوتی ہے تو سفارش کرنے والے کی
خوشامد کرنی پڑتی ہے۔ اس سے ملاقات کے لئے گھنٹوں انتظار کرنا پڑتا ہے، جب وہ شام کو گھر آتا
ہے تو پتہ چلتا ہے کہ نہ پانی ہے، نہ بجلی، اور نہ گھریلو سکون، جب وہ بیمار ہوتا ہے تو ہسپتالوں میں
مریضوں کے جم غفیر میں کھو جاتا ہے۔ بچوں کو اسکول میں داخل کرانا ہوتا ہے تو داخلہ کے لئے نہ تو
فیس ہوتی ہے اور نہ یونیفارم اور کتابوں کے لئے پیسہ۔ اس کی زندگی محرومیوں، بے بسی، اور محتاجی
کی زندگی ہو جاتی ہے مگر ساتھ ہی وہ یہ بھی دیکھتا ہے کہ امراء شاندار گاڑیوں میں سفر کرتے ہیں، شہر
کی مہنگی ہوٹلیں امیر گاہکوں سے بھری ہوتی ہیں، ان کے بچے مہنگے اسکولوں میں صاف ستھری اور
خوبصورت یونیفارم میں اسکول جا رہے ہیں، ان کے محلوں میں خوبصورت سرسبز بنگلے ہیں، جن پر
گارڈ پہرہ دے رہے ہیں، تو ان میں اور زیادہ بے بسی کے جذبات پیدا ہوتے ہیں، اور وہ خود اپنی
نظروں میں ذلیل اور حقیر ہو جاتے ہیں۔

اب جب کوئی احتجاج ہوتا ہے اور یہ بے بس، کمزور، اور مجبور لوگ اس میں شامل ہوتے ہیں
تو مجمع ان کی کمزوری کو طاقت میں بدل دیتا ہے، ان کی بے بسی، توانائی کی شکل اختیار کر لیتی ہے،
پولیس، رینجرز یا فوج کا خوف ایک دم غائب ہو جاتا ہے اس کی جگہ بے خوفی اور دلیری آجاتی ہے،

اب دنیا ان کے لئے حقیر ہو جاتی ہے وہ ایک سیلاب کی شکل اختیار کر لیتے ہیں کہ جو ہر چیز کو بہا کر لے جانے کی اہلیت رکھتا ہے۔ اس لئے وہ اب اپنے اس غصہ کا اظہار کرتے ہیں کہ جو ان کے اندر پرورش پا رہا ہوتا ہے اور جس کے اظہار کے راستے بند ہوتے ہیں، اب ریاست اور اس کے ادارے جو اس کے لئے جبر، ظلم اور استحصال کی علامتیں تھیں، وہ کمزور اور خستہ ہو کر گر جاتی ہیں، وہ اب راستے میں آنے والی ہر چیز کو تہس نہس کر کے آگے بڑھتا ہے، اب مجمع کے سامنے کوئی رکاوٹ اسے روک نہیں سکتی ہے، وہ پولیس سے مقابلہ کرتا ہے، وہ اس کی لاٹھیوں، اشک آور شل، یا گولیوں سے نہیں ڈرتا ہے اور برابر آگے بڑھتا ہے۔

پاکستان میں ایسے احتجاج کے موقعوں پر مجمع ہوٹلوں کو آگ لگاتا ہے، کیونکہ یہ وہ ہوٹلیں ہیں کہ جہاں اس کا گزر نہیں ہو سکتا ہے وہ بحیثیت فرد کے یہاں کھانا نہیں کھا سکتا ہے۔ وہ سینماؤں کو آگ لگاتا ہے، کیونکہ یہ تفریح بھی اس کی پہنچ سے دور ہے۔ جب مجمع کے کچھ لوگوں میں مذہبی تعصب ہو تو وہ دوسرے غیر مذاہب کے لوگوں کی عبادت گاہوں کو جلاتے ہیں لیکن خاص طور سے ان کے غصہ کا مرکز پبلک عمارتیں ہوتی ہیں، کیونکہ وہ حکومت کو اپنے لئے استحصال کا ادارہ سمجھتے ہیں، اس لئے ریاست کی ہر علامت کو مٹا ڈالنے کا عزم رکھتے ہیں۔

لیکن جب مجمع منتشر ہوتا ہے تو فرد پھر اکیلا رہ جاتا ہے، اور اکیلا فرد پھر بے بسی، خوف، اور محرومی کی حالت میں واپس چلا جاتا ہے۔ اس لئے ان مجبور اور محتاج افراد کی خواہش ہوتی ہے کہ بار بار احتجاج ہو، تاکہ وہ اپنے غصہ کا پوری طرح سے اظہار کر سکیں۔ لوگوں کے احتجاج کے نتیجے میں ہونے والے فسادات کو پولیس یا فوج کے تشدد سے ختم نہیں کیا جا سکتا ہے۔ عوام ناانصافی اور محرومی کے نتیجے میں بار بار مظاہرے کرتے ہیں اور اپنے غصے کو تشدد کے ذریعہ ظاہر کرتے ہیں۔ اس کا خاتمہ اسی وقت ہو سکتا ہے جبکہ ریاست لوگوں کو انصاف اور بنیادی حقوق دے کر ان کی محرومیوں کا ازالہ کرے۔ ایک ایسے معاشرے میں جہاں لوگ خوش حال ہوں اور ان کی جان و مال کا تحفظ ہو وہاں وہ پُرامن زندگی گزارنے کو ترجیح دیتے ہیں۔

ہندوستان و پاکستان کے تعلقات

ہندوستان اور پاکستان کے تعلقات کو سمجھنے کے لئے تاریخ کا مطالعہ ضروری ہے، کیونکہ تاریخ واقعات اور حالات کو قلم بند کرتی ہے، اور ان واقعات کو جس نقطہءنظر سے لکھا جاتا ہے، وہ قاری کے ذہن کو متاثر کرتا ہے، مثلاً اگر تاریخ کو محض ہندو اور مسلم تنازعہ کی روشنی میں لکھا جائے گا، اور ان کے درمیان جو اشتراک تھا، یا ہے، اس کو نظرانداز کر دیا جائے گا، تو اس سے یہی تاثر ابھرے گا کہ ہندوستان میں یہ دونوں قومیں، یا کمیونٹیز ہمیشہ سے ایک دوسرے سے لڑتی جھگڑتی رہی ہیں اور ان کے درمیان کبھی کوئی مشترکہ قدر یا ضرورت نہیں رہی کہ جو ان دونوں کو پُرامن رکھتی۔

چونکہ ہماری تاریخ دوقومی نظریہ پر انحصار کرتی ہے، اس لئے اسے اشتراکی یا مشترک قدروں کے بجائے اختلاف اور فرق کو ابھارنے کی ضرورت ہوتی ہے اور یہ تاریخی نقطہءنظر دونوں مذاہب کے لوگوں کو ایک دوسرے سے دور کر دیتا ہے۔

دوسرا اہم نقطہءنظر یہ ہے کہ اگر دونوں میں فرقہ وارانہ فسادات ہوتے رہے ہیں تو ان کی ذمہ داری کس پر ہے۔ ہماری تاریخ میں ہم اس کا ذمہ دار ہندو انتہا پسندوں کو قرار دیتے ہیں، جس کے نتیجہ میں فسادات کی ذمہ داری ان پر عائد ہو جاتی ہے اور ہم اس الزام سے بچ جاتے ہیں۔

تیسرا نقطہءنظر یہ ہے کہ اپنی بات یا دلیل کو درست ثابت کرنے کی غرض سے تاریخ کا مکمل جائزہ نہیں لیا جائے اور جہاں جہاں ضرورت ہو، وہاں مخالف دلیل یا نقطہءنظر کو نظرانداز کر دیا جائے۔ اس کا مطلب ہے کہ تاریخ کو ادھورا لکھ کر اپنی بات کو درست ثابت کیا جائے۔ مثلاً ہم تحریک پاکستان کی تاریخ میں مرکز ہندو دشمنی قرار دیتے ہیں اور ان مسلمانوں کا بالکل تذکرہ نہیں کرتے کہ جو اس تحریک کے مخالف تھے۔ اس طرح واقعات کو نظرانداز کر کے ہم اپنی پسند کی تاریخ

لکھتے ہیں۔

ہندوستان اور پاکستان کے تعلقات کو تاریخ کی روشنی میں دیکھا جائے تو ہم اس فرق اور اختلاف کو بہتر طریقہ سے سمجھ پائیں گے کہ جو ہندوؤں اور مسلمانوں میں ہے۔اس اختلاف کی جڑیں کولونیل دور یا انگریزی حکومت میں دیکھا جا سکتا ہے کہ جب انگریزوں نے مذہبی شناخت کو سیاسی مقاصد کے ساتھ ابھارا۔ مثلاً سب سے پہلے انہوں نے تاریخ کو مذہبی رنگ دیا، اور اس کو ہندو اور مسلمان ادوار میں تقسیم کیا، اس کے بعد انہوں نے اس نظریہ کو مقبول بنایا کہ مسلمان حکمرانوں کے دور میں ہندو رعایا پر ظلم وستم ہوتا تھا اور انہیں کسی قسم کی آزادی نہیں تھی۔

جب 1830ء کے بعد یہاں عیسائی مشنریوں کو اجازت ملی کہ وہ آئیں اور عیسائی مذہب کی تبلیغ کریں تو اس نے ہندوؤں اور مسلمانوں، دونوں کو اپنے اپنے مذہب کے بچاؤ کے لئے تیار کیا۔اس زمانہ میں ہندوستان میں مناظروں کا سلسلہ شروع ہوا جس میں ہندو، مسلمان، اور عیسائی مبلغین اور علماء شریک ہوتے تھے اور اپنے اپنے مذاہب کی خوبیاں بیان کر کے دوسرے مذاہب کو نیچا دکھاتے تھے۔ان مناظروں میں ایک بڑی تعداد لوگوں کی شریک ہوتی تھی، اس نے مذہبی تضادات کو ابھارا اور مذہبی جھگڑوں کو پیدا کیا۔

جب 1881ء میں پہلی مردم شماری ہوئی تو اس میں مذہب کے خانے کو رکھ کر لوگوں کی مذہبی شناخت کو اجاگر کیا گیا۔ جب سکھوں کو ہندوؤں کے زمرے میں شامل کیا گیا تو انہوں نے احتجاج کیا کہ وہ ہندو نہیں ہیں۔اس لئے اگر تاریخ کو اس نقطۂ نظر سے دیکھیں تو یہ نظر آتا ہے کہ دوقومی نظریہ کی پیداوار کولونیل دور میں ہو گئی تھی، جسے بعد میں حالات نے اور زیادہ آگے بڑھایا، اور تاریخ کو مذہبی رنگ میں ڈھال کر، اسے مذہبی نقطۂ نظر سے لکھا بھی جانے لگا اور پڑھنے والے بھی اس سے متاثر ہوئے، اور یہی ذہن بنا کہ ہندوستان میں ہندو اور مسلمان دو علیحدہ علیحدہ کمیونٹیز یا قومیں ہیں۔

پاکستان کی تاریخ نویسی پر بھی اس کا اثر ہوا۔ جب تحریک پاکستان کی تاریخ لکھی گئی تو اس میں کولونیل دور یا انگریزی حکومت پر گہرائی سے نظر نہیں ڈالی گئی اور پوری تاریخ کو ہندو مسلم تضادات کی روشنی میں لکھا گیا۔

جب سیاست میں کش مکش کا ذکر آیا، یہ پرولتاریہ کش مکش اگرچہ کانگرس اور مسلم لیگ میں

تھی، مگر کانگرس کے بارے میں یہ تاثر دیا گیا کہ یہ ہندوؤں کی جماعت تھی جو ہندوؤں کے مفادات میں کام کررہی تھی اور مسلمانوں کے حقوق کا اسے احساس نہیں تھا۔ کانگریس کے بارے میں یہ تاثر غلط ہے، کیونکہ یہ ایک سیکولر جماعت تھی جس میں ہندوؤں کے علاوہ پارسی، مسلمان اور عیسائی شامل تھے یہ ہندوستان کے تمام رہنے والوں کی نمائندگی کا دعویٰ کرتی تھی۔ جبکہ مسلم لیگ صرف مسلمانوں کی جماعت تھی، جس میں دوسرے مذاہب کے لوگ شامل نہیں تھے۔

کانگرس اور مسلم لیگ کے اس تضاد میں ہم نے اپنی تاریخ سے ان تمام راہنماؤں کو نکال دیا کہ جن کا تعلق اس جماعت سے تھا۔ مثلاً مولانا ابوالکلام آزاد کو بھی ہم نے مسلمان مخالفوں میں شامل کر کے ان پر تنقید کی۔ جمعیت علماء ہند کو بھی ہم نے نظرانداز کر دیا کہ اس نے کانگرس کا ساتھ دیا تھا۔

اس صورت میں تحریک پاکستان کا مرکز ہندو دشمنی ہوگئی، اور اس بنیاد پر ہماری تاریخ لکھی گئی۔

جب تقسیم کے وقت فرقہ وارانہ فسادات ہوئے، تو انگریزی حکومت نے انہیں روکنے کی کوشش نہیں کی۔ اس کی تفصیلات واپرٹ کی کتاب ''Shameful Flight'' میں تفصیل سے موجود ہے۔ آبادی کی منتقلی نے سندھ اور پنجاب کے پلورل (Plural) کلچر کا خاتمہ کر دیا۔ ایک نیا دور شروع ہوا کہ جس کی ابتداء قتل و غارت گری اور لوگوں کی ہجرت سے ہوئی۔ انگریز جاتے وقت دونوں ملکوں کے درمیان سرحدی تنازعات کو بھی چھوڑ گئے۔ یہ برصغیر ہی میں نہیں ہوا، بلکہ ایشیا و افریقہ جہاں سے بھی یہ کولونیل حکمراں گئے سرحدوں کو تبدیل کر کے اپنے پیچھے جھگڑے چھوڑ گئے، اور جس کی وجہ سے ہمسایہ ممالک ان تنازعات کے حل کے لئے جنگیں لڑتے رہے۔

ان تنازعات کے حل کے لئے پاکستان و ہندوستان نے ایک دوسرے کے ساتھ جنگیں بھی لڑیں، اور ایک دوسرے کے اندرونی معاملات میں دخل دے کر حکومتوں کو غیر مستحکم کرنے کی کوشش بھی کی۔ اس کے علاوہ وقتاً فوقتاً گفت و شنید بھی ہوئی، مگر جب دونوں اپنے موقف پر سختی سے قائم ہوں تو جھگڑوں کا حل نہیں نکلتا ہے۔ اس صورت حال کی وجہ سے ہم نے جانی و مالی نقصان کے علاوہ اپنی توانائی اور پیسہ استعمال کر کے بے حد نقصان اٹھایا۔

ہندوستان دشمنی کا تاثر ہمارے معاشرے پر کئی طرح سے اثر انداز ہوا۔ نصاب کی کتابوں

میں ہندو مسلمانوں کے دشمن ثابت کئے گئے ۔اخبارات اور ٹی وی پر ہندوستان کے خلاف مسلسل پروپیگنڈا کیا گیا۔ یہاں تک کہ کچھ لوگ تو ہندوستان کا نام لینے سے ہچکچاتے ہیں، اور اسے ایک ہمسایہ ملک کہہ کر بات کرتے ہیں۔

اب سوچنے کی بات یہ ہے کہ کیا ماضی کے تجربات سے ہم نے کچھ سیکھا ہے؟ اگر سیکھا ہے تو ہمیں بہت پہلے اپنی تاریخ کو اس نفرت ، اور عداوت سے پاک کرنا ہوگا، اور نصاب کی کتابوں سے ایسے مواد کو نکالنا ہوگا جس میں دشمنی اور نفرت کے جذبات ہیں۔ ہندوستان میں حالیہ حکومت کے دور میں جو نصاب کی کتابیں تیار ہوئی ہیں، خاص طور سے تاریخ کی، اس میں قطعی پاکستان یا مسلمانوں کے خلاف کوئی مواد نہیں ہے اور اس میں تاریخ کو موثر ذہنی شعور کے لئے بطور ہتھیار استعمال کیا گیا ہے۔

ہمیں کسی سقراط کی ضرورت ہے

ہم اکثر اس خواہش کا اظہار کرتے ہیں کہ ہمارے ہاں پھر کوئی محمد بن قاسم، محمود غزنوی اور محمد غوری پیدا ہو جائیں تاکہ فتوحات اور توسیع سلطنت کے ذریعہ ہماری عظمت دوبارہ سے قائم ہو جائے۔ اس خواہش کے پس منظر میں ہماری تاریخ کا وہ نظریہ ہے کہ جس میں فاتحین اور جنگجو ہیرو ہوتے ہیں، جو دشمنوں کو شکست دے کر مالِ غنیمت میں دولت کے انبار لاتے ہیں اور ساتھ میں غلاموں اور کنیزوں کی قطاریں ہوتی ہیں۔ اگرچہ تاریخ میں بڑی بڑی سلطنتیں مٹ گئیں، فاتحین کا نام ونشان بھی نہ رہا، مگر ان کے ناموں کے ذریعہ اب بھی قوم میں جذبہ اور جوش کو ابھارا جاتا ہے۔

جب کہ ان کے مقابلہ میں علمی اور ادبی شخصیتوں کا ذکر اس فخر سے نہیں کیا جاتا ہے وہ لوگ کہ جنہوں نے ذہنوں کو جلا بخشی، علم کے ذریعہ آگہی اور شعور کو پیدا کیا، وہ ان کے مقابلہ میں کم تر ہیں۔

اس وقت ہمارا معاشرہ جس صورتِ حال سے دوچار ہے، اس میں رشوت، کرپشن اور بدعنوانیاں عروج پر ہیں۔ اخلاقی اقدار کو پامال کر دیا گیا ہے، قانون کی بالادستی کا وجود نہیں ہے، عدل اور انصاف صرف طاقتور کے لئے ہے، کمزور طبقوں کے لوگ عدم تحفظ کا شکار ہیں۔ سیاستداں اپنے ذاتی مفادات کے کاموں میں مصروف ہیں، معاشرہ میں اس قدر افراتفری اور انتشار ہے کہ ایک دوسرے پر اعتبار نہیں رہا ہے، دھوکہ بازی، فریب اور جھوٹ کامیابی کے لئے لازمی ہو گئے ہیں۔

جب معاشرہ اس بدحالی کا شکار ہو جائے، جب اس کی پس ماندگی بڑھ جائے اور جب علم و ادب کے سوتے خشک ہو جائیں، تو ایسے معاشرے میں ہمیں کس کی ضرورت ہے، کیا ہمارے فاتحین اور جنگ جو آ کر ہمیں اس سے نجات دلا سکتے ہیں، کیا محمد بن قاسم، یا محمود غزنوی یا غازی صلاح الدین ہماری ان سماجی، معاشی اور سیاسی ابتری کا علاج ہو سکتے ہیں۔ اگر ایسا نہیں تو پھر ہم ان کے آنے کی خواہش کیوں کرتے ہیں؟

ایسے ماحول میں ایک ایسے فلسفی، مفکر اور دانشور کی ضرورت ہوتی ہے کہ معاشرے کے سماجی، معاشی اور سیاسی مسائل کے بارے میں آگہی دے اور وہ افکار اور نظریات دے کہ جن کی روشنی میں ان مسائل کو سمجھا جا سکے اور ان کا حل تلاش کیا جا سکے۔ ایتھنز میں ایک ایسا شخص تھا کہ جو شہر کے لوگوں میں نیکی اور خیر کی تعلیم دیتا تھا، یہ ایک درویش صفت انسان تھا کہ جس کے ہاں نہ مال و دولت تھی اور نہ وسائل کہ جن کے سہارے وہ عیش و آرام کی زندگی گزار سکے۔ یہ میلے کچیلے لباس میں ملبوس ننگے پیر ایتھنز کی گلیوں، بازاروں اور شہر کے معروف چوک پر چکر لگایا کرتا تھا اور جو اسے مل جاتا تھا اس سے سوالات پوچھتا تھا، وہ خود کو نہ تو دانش مند سمجھتا تھا، نہ عالم اور نہ مفکر، بلکہ سوال کرتا تھا تا کہ سیکھ سکے، اس کا انداز بڑا انوکھا تھا، مثلاً ایک دن اسے ایک نوجوان راستے میں مل گیا، اس سے سوال کیا کہ ''نوجوان، کیا تم بتا سکتے ہو کہ روٹی کہاں سے ملے گی؟'' اس پر نوجوان نے حیرانی سے اسے دیکھا اور کہنے لگا، وہ گلی کے نکڑ پر دکان ہے وہاں سے مل جائے گی، اس پر سقراط نے دوسرا سوال کیا، ٹھیک ہے، مگر یہ بتاؤ کہ نیکی کہاں سے ملے گی؟ اس پر نوجوان پریشان ہو گیا، اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ اس کا کیا جواب دے۔ اس پر سقراط نے کہا، اچھا، میرے ساتھ آؤ، میں بتاتا ہوں کہ نیکی کہاں سے ملے گی، اور پھر وہ اسے لیکچر دیتا ہے کہ نیکی انسان کے اندر ہے، اگر تم ہر چیز کو خیر کی نظر سے دیکھو گے تو برائی سے بچ جاؤ گے۔ نیکی انسان کی فطرت میں ہے، اسے تلاش کرنے کی ضرورت ہے یہ زندگی کو شر سے بچاتی ہے، اور انسان کو خوشی و مسرت دیتی ہے۔

افلاطون نے اپنی کتاب ''ریپبلک'' میں سقراط کے حوالے دیئے ہیں جن سے اندازہ ہوتا ہے کہ زندگی اور سماج میں اخلاقی قدروں کے بارے میں اس کے کیا نظریات تھے۔ سقراط نے خود تو کچھ نہیں لکھا۔ اس نے جو کچھ باتیں کہیں، یا بحث و مباحثہ میں حصہ لیا، اس کا ذکر افلاطون اور زینوفان نے کیا ہے جو اس کے شاگردوں میں سے تھے۔ ایتھنز میں یہ دستور تھا کہ کھانے پر جو سمپوزیم کہلاتا تھا، اس میں شریک ہونے والے اہم موضوعات پر بحث و مباحثہ کرتے تھے۔ ایک ایسے ہی موقع پر جب یہ سوال آیا کہ عدل یا انصاف کیا ہے، تو ایک سوفسٹ (Sophist) نے کہا کہ طاقت ور ہمیشہ درست ہوتا ہے، جس کے پاس طاقت ہے عدل بھی اس کی مرضی کے مطابق ہوتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ کمزور لوگوں کے لئے کوئی عدل و انصاف نہیں، اگر چہ انصاف کا مطالبہ سب سے زیادہ کمزور لوگ ہی کرتے ہیں، کیونکہ ان کے ذریعہ وہ اپنا تحفظ چاہتے ہیں، مگر سوفسٹ نے وہ بات کہی کہ جو 19

صدی میں سوشل ڈارون ازم کے حامی کہتے تھے کہ طاقت ور کو جینے کا حق ہے، کمزور کے لئے اس دنیا میں کوئی جگہ نہیں ہے، سقراط نے اس کی زبردست مخالفت کی، اس کے نزدیک عدل کا تعلق اہم اخلاقی قدر سے ہے، جو انسان کو پاکباز اور نیک بناتی ہے۔ اگر طاقت ور کو یہ حق مل جائے تو معاشرہ انتشار کا شکار ہو جائے گا۔ عدل اور انصاف طبقات میں توازن قائم رکھتا ہے۔

اس طرح ایک مکالمہ میں وہ سیاستدانوں کو ڈاکٹروں یا حکیموں سے تشبیہ دیتا ہے جس طرح ان کا فرض ہوتا ہے کہ مریض کو بیماریوں سے نجات دلائیں اور اسے صحت مند رکھیں، اسی طرح سے ایک سیاستدان کا یہ کام ہے کہ قوم کی خدمت کرے اور اس کے مسائل کو حل کرے۔ سقراط سب سے زیادہ اہمیت معاشرے میں اخلاقی اقدار کو دیتا ہے، جو اسے برائیوں سے بچاتی ہیں، اور اس کو متحرک رکھتی ہیں، اگر یہ اخلاقی اقدار پامال ہو جائیں اور افراد ان کی پابندیوں سے آزاد ہو جائیں تو سماج ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے گا۔ سقراط انسان کی فطرت کو نیکی کی طرف مائل سمجھتا ہے، مگر حالات اسے برائی کی طرف لے جاتے ہیں، لہٰذا مفکروں، فلسفیوں اور دانشوروں کا کام ہے کہ انسانی فطرت میں نیکی کو مضبوط کریں۔

ایتھنز کا معاشرہ سقراط کے اس فلسفہ کو برداشت نہیں کر سکا، اور اس پر جو الزامات لگائے گئے ان میں نوجوانوں کو گمراہ کرنا تھا، دیوتاؤں کی پرستش کرنا شامل تھا، جس دن اس پر مقدمہ سے انکار چل رہا تھا، اسی دن عدالت میں وہ ایک دوست سے ملتا ہے اور اس سے پرہیزگاری کے موضوع پر بحث شروع کر دیتا ہے۔ مقدمہ میں اس نے اپنا دفاع خود کیا، اور اس پر جو الزامات لگائے گئے تھے ان کا جواب دیا۔ اس نے جلاوطن ہونے سے بھی انکار کیا، اور جرمانہ کی رقم دینے سے بھی، اور زہر کا پیالہ پی کر موت کو ترجیح دی۔

اس لئے سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر کوئی سقراط ہمارے معاشرے میں آ جائے، اور عمل و انصاف کی بات کرے، مذہبی انتہا پسندوں کو برا کہے، نفرت وتعصب و فرقہ بندی پر تنقید کرے، بدعنوانیوں اور کرپشن کو سماج کے لئے لعنت قرار دے، سیاستدانوں کا احتساب کرے، کمزور اور بے بس لوگوں کے حقوق کے لئے جدوجہد کرے، دھوکہ، جھوٹ اور فریب سے دور رہنے کی تلقین کرے۔ کیا ایسے شخص کو ہمارا سماج برداشت کرے گا، یا اسے بھی سقراط کی طرح الزامات لگا کر زندگی سے محروم کر دیا جائے گا۔ کیونکہ جب سماج پستی میں چلا جاتا ہے اور جب اخلاقی اقدار ختم ہو جاتی ہیں تو اس صورت میں سچ کو برداشت کرنا مشکل ہوتا ہے۔ لہٰذا ایسے شخص سے چھٹکارا پا کر لوگ مطمئن اور خود کو محفوظ سمجھنے لگتے ہیں۔

یونیورسٹی کی ابتداء

یورپ اور ایشیا کی ابتدائی تہذیبوں میں کوئی تعلیمی ادارہ نہیں ہوتا تھا۔ تعلیم، استاد اور شاگرد کے رشتہ کے ذریعہ دی جاتی تھی۔ طالب علم کسی استاد کے گرد جمع ہو جاتے تھے اور اس سے علم حاصل کرتے تھے۔ قدیم یونان میں سقراط کا طریقہ کار یہ تھا کہ وہ نوجوانوں سے مکالمہ کرتا تھا، ان سے سوالات پوچھا کرتا تھا، اور گھوم پھر کر تعلیم دیا کرتا تھا۔ اس ذریعہ تعلیم میں تبدیلی لانے والا اس کا شاگرد افلاطون تھا کہ جس نے ایتھنز شہر سے باہر درختوں کے جھنڈ میں اکیڈمی نامی تعلیمی ادارہ کی ابتداء کی۔ ایک لحاظ سے اسے قدیم یونیورسٹی کہا جا سکتا ہے۔ اسی اکیڈمی میں ارسطو، اس کے شاگرد کی حیثیت سے بیس سال تعلیم حاصل کرتا رہا۔ اکیڈمی کے تعلیمی معیار کا اندازہ اس سے ہوتا ہے کہ آگے چل کر یا بعد میں اپنے استاد کے فلسفہ پر گہری تنقید کی اور علمی تحقیق کو اور آگے بڑھایا۔

افلاطون کی وفات کے بعد ارسطو نے اپنا ادارہ لےسیم (Lycium) کے نام سے قائم کیا۔ اکیڈمی اور لےسیم دونوں ادارے علمی تحقیق اور خاص طور سے فلسفہ کے مراکز رہے۔

رومیوں کے زمانہ میں بھی ہمیں تعلیمی اداروں کا ذکر ملتا ہے۔ جہاں خصوصیت سے فن خطابت، گرامر، منطق اور قانون کی تعلیم دی جاتی تھی۔ باقی دوسرے علوم کے لئے اب تک اہل حرفہ کی برادریاں تھیں، جہاں استاد شاگردوں کو انجینئرنگ، ریاضی، خطاطی، اور دوسرے فنون اور علوم میں تربیت دیا کرتے تھے۔ یہ سلسلہ یورپ میں عہد وسطیٰ تک جاری رہا، لیکن باقاعدہ یونیورسٹی کی ابتداء 1088ء میں اٹلی کے شہر بولونیا میں ہوئی، اس کے ابتدائی زمانہ میں داخلہ کا کوئی خاص نظام نہیں تھا، اس لئے ہر عمر کے لوگ داخلہ لے سکتے تھے۔ ذریعہ تعلیمی لاطینی زبان تھا، جو یورپ کی علمی زبان تھی۔ اس کے شروع زمانہ میں یہاں قانون کی تعلیم دی جاتی تھی، کیونکہ اس کی بیوروکریسی اور معاشرہ میں ضرورت تھی۔ بعد میں یہاں الٰہیات، گرامر، فن خطابت، اور منطق کا اضافہ ہوا۔

اس یونیورسٹی کی خاص بات یہ تھی کہ اس کا سارا انتظام طالب علم کیا کرتے تھے وہی اساتذہ کو تنخواہ دیا کرتے تھے، اگر اساتذہ کو رخصت پر جانا ہوتا تھا تو اس کی اجازت طالب علموں سے لیا کرتے تھے۔ اگر کوئی استاد وقت پر نہیں آتا تھا یا زیادہ چھٹیاں کرتا تھا تو اس کے پیسے کٹ جایا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ طلبہ کلاسوں کے لئے عمارت کرایہ پر لیتے تھے۔ اس وقت تک ہاسٹل نہیں تھے، اس لئے شہر میں کرایہ کے کمروں میں رہتے تھے۔ اگر عمارت کے مالکین کرایہ بڑھاتے، یا ان کے کھانے کے نرخوں میں اضافہ ہوتا تھا تو وہ اسٹرائک کرتے تھے اور اس ذریعہ سے اپنے مطالبات منوایا کرتے تھے۔

یونیورسٹی میں سال کے آخر میں امتحان ہوا کرتے تھے۔ یہاں طالب علموں کا عمل دخل نہیں تھا، اور یہ استاد کی ذمہ داری تھی کہ وہ شاگردوں کی لیاقت کے مطابق انہیں نمبر دے، ڈگری دینے کا رواج بھی یہاں سے ہی شروع ہوا، بعد میں کورسز کی مدت کا تعین بھی کیا گیا۔

اس کے مقابلہ میں پیرس یونیورسٹی کا انتظام طلباء کے پاس نہیں تھا، بلکہ یہاں اساتذہ کی ذمہ داری تھی کہ وہ یونیورسٹی کے انتظام کو دیکھیں، یہاں تنخواہ بھی اساتذہ کو اس فنڈ کے ذریعہ دی جاتی تھی جو طلباء کی فیسوں سے جمع ہوتا تھا۔

بعد میں اس ماڈل پر آکسفورڈ، کیمبرج، پراگ اور کراکو کی یونیورسٹیاں قائم ہوئیں، چونکہ ان یونیورسٹیوں میں الٰہیات یا تھیالوجی اہم مضامین تھے۔ اس لئے ان کو پوپ سے چارٹر لینا ہوتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان کی ڈگریاں پورے یورپ میں تسلیم کی جاتی تھیں۔ ڈگریوں میں بیچلر یا بی اے، ایم۔اے، پی۔ایچ۔ڈی یا ڈاکٹریٹ کی ڈگریاں تھیں۔ بولونیا یونیورسٹی نے قانون اور بعد میں طب کے شعبہ جات میں شہرت حاصل کی جبکہ پیرس کی یونیورسٹی الٰہیات کے مضمون میں مشہور تھی۔

یونیورسٹی کے طلباء کو پوپ نے کلرجی (Clergy) یا مذہبی طبقہ میں شامل کر لیا تھا۔ اس لئے یہ ایک مراعات یافتہ طبقہ ہو گیا تھا، جس کا یہ اکثر ناجائز فائدہ اٹھاتے تھے۔ شراب کی عادت بہت عام تھی، نشہ میں ان کے لڑائی جھگڑے بھی ہوتے تھے۔ اگر شہریوں سے جھگڑے میں یہ زخمی ہو جاتے، یا انہیں مارا پیٹا جاتا تو اس جرم میں شہریوں کو چرچ عیسائیت سے خارج کر دیتا تھا۔ اس لئے شہری ان سے خوف زدہ رہا کرتے تھے۔

ابتدائی دور میں یونیورسٹی کی اپنی کوئی عمارت نہیں ہوتی تھی، یہ کرایہ کی بلڈنگوں میں ہوا کرتی تھی۔ اس لئے کئی بار ایسا ہوا کہ جب کرایہ بڑھایا گیا تو یونیورسٹی کو شہر سے باہر دوسری جگہ لے جایا گیا۔ مثلاً پیرس یونیورسٹی تین سال شہر سے باہر ایک گاؤں میں رہی، مگر جب شہر کے لوگوں کو احساس ہوا کہ اس کی وجہ سے انہیں مالی نقصان ہو رہا ہے تو وہ اسے واپس شہر میں لے آئے۔

یونیورسٹی کا نصاب محدود تھا۔ استاد کو چیلنج نہیں کیا جاتا تھا۔ امتحان میں نصاب کی کتابوں کو رَٹ کر امتحان پاس کیا جاتا تھا۔ اس لئے ذہین اور قابل طالب علموں کے لئے اس میں ترقی کرنے اور آگے بڑھنے کے مواقع بھی کم تھے۔

نصاب میں اس وقت بنیادی تبدیلی آئی، جب اٹلی میں ریناساں تحریک کی ابتداء ہوئی، اور اس نے انسانیت دوست یا (Humanists) دانشوروں کے گروہ کو پیدا کیا، انہوں نے نصاب کی اس خرابی کو محسوس کرتے ہوئے، اس کو تبدیل کر کے اس میں جن نئے مضامین کی ابتداء کی ان میں فلسفہ، ریاضی، موسیقی، تاریخ، ادب اور جغرافیہ شامل تھے۔ اس وجہ سے انہیں اب ہیومنٹیز (Humanities) کہا جاتا ہے۔ ان علوم کی وجہ سے یونیورسٹی میں تبدیلی آئی، اور یہاں سائنس اور سماجی علوم میں تحقیق کی ابتداء ہوئی۔

اب تک یورپ کی یونیورسٹی مذہب کے زیر اثر تھی، اور اس کی وہی حیثیت تھی کہ جو ہمارے ہاں مدرسہ کی ہے، مگر ان علوم کو نصاب میں داخل کرنے کے بعد اس کے کریکٹر میں تبدیلی آئی اور یہ جدید علمی مدرسہ کی شکل میں ابھرے۔

اس کے بعد یورپ میں یونیورسٹیوں کا جال پھیل گیا، یہ وہ زمانہ تھا کہ جب یورپ کے مہم جو نئے جغرافیائی راستے دریافت کر رہے تھے، نئے تجارتی رشتے غیر ملکوں سے قائم ہو رہے تھے، ان کا معاشرہ بدل رہا تھا، اور اس تبدیلی میں ان کی یونیورسٹی کا بڑا اہم حصہ تھا۔

آگے چل کر جدید یونیورسٹی کی تشکیل میں جرمنی کا کردار اہم ہے، جس نے یونیورسٹی میں ہر مضمون کے علیحدہ شعبہ کی ابتداء کی، سیمینار اور سمسٹر سسٹم شروع کیا، اور تحریری و زبانی امتحان کے رواج کو شروع کیا۔ اس ماڈل کو یورپ اور امریکہ میں اختیار کرتے ہوئے انہوں نے اپنے ہاں یونیورسٹیاں قائم کیں، جو آج بھی علمی تحقیق کے مراکز ہیں۔

طاقتور اور کمزور لوگ

1859ء میں چارلس ڈارون نے اپنی کتاب Origin of Species یا مخلوقات کی بنیاد شائع کی۔ کتاب کے شائع ہونے کے ایک ہفتہ کے اندر اندر اس کی بیس ہزار کاپیاں فروخت ہوگئیں، جب کہ یہ کتاب نہ تو ناول ہے، اور نہ اس میں کوئی سنسنی خیز جاسوسی مواد ہے۔ لیکن اس نے شائع ہونے کے بعد دنیا میں ایک زبردست ذہنی انقلاب پیدا کیا۔ کیونکہ اب تک مذہب کا نظریہ تخلیق لوگوں کے ذہن میں تھا، اس نے اس کے برعکس سائنس کی تحقیق کی بنیاد پر ثابت کیا کہ دنیا کی مخلوقات کا مرحلہ وار ارتقاء ہوا ہے، اور اس ارتقائی عمل میں جو مخلوق طاقت ور تھی اور جس نے ماحول اور حالات کا مقابلہ کیا وہ تو زندہ رہی اور آگے بڑھتی رہی، مگر کمزور مخلوقات ماحول اور حالات کا مقابلہ نہ کرنے کی صورت میں ختم ہوتی چلی گئیں، اس سے یہ نتیجہ نکالا گیا کہ دنیا میں طاقت ور حالات کا مقابلہ کر سکتے ہیں، اور زندہ رہ سکتے ہیں جب کہ کمزور کے لئے موت اور فنا ہے۔

ڈارون کے اس نظریہ یعنی Survival of the Fittest کی بنیاد پر انگلستان کے ایک فلسفی، ہربرٹ اسپینسر (Herbert Spencer) نے سوشل ڈارون ازم کے نظریہ کو پیش کیا۔ اس نظریہ کے تحت اقوام عالم میں وہی قومیں نہ صرف زندہ رہ سکتی ہیں، بلکہ اپنی طاقت اور توانائی کی بنیاد پر دوسری اقوام پر حکومت کا بھی حق رکھتی ہیں۔ اس نے نسل پرستی کے نظریہ کو پیدا کیا، کہ کچھ اقوام نسلی طور پر برتر اور افضل ہیں، اور کچھ اقوام نسلی طور پر کم تر ہیں۔ اس لئے برتر اقوام کو حق ہے کہ ان پر حکومت کریں۔

سوشل ڈارون ازم کے نظریہ کو اس وقت یورپ میں فروغ ملا کیونکہ یہ وہ زمانہ تھا جب یورپی امپیریل ازم اپنی بلندی پر تھا اور ایشیا و افریقہ مما لک پر اپنا سیاسی و معاشی تسلط قائم کر رکھا تھا۔ اس نظریہ نے اسے اخلاقی جواز فراہم کیا کہ چونکہ سفید فام اقوام نسلی طور پر برتر ہیں، اس لئے یہ ان کا

حق ہے کہ وہ کمزور اقوام پر حکومت کریں۔ کپلنگ کے نظریہ سفید آدمی کے بوجھ میں بھی اس کی جھلک ملتی ہے جس کا کہنا تھا کہ سفید اقوام چونکہ مہذب اور متمدن ہیں، اس لئے اب ان کا یہ فرض ہے کہ وہ ایشیا و افریقہ کی اقوام کو تہذیب سکھائیں۔

آگے چل کر سوشل ڈارون ازم جرمنی میں نازی پارٹی کی شکل میں آیا جس میں جرمن آریہ نسل کی پاکیزگی اور خالص ہونے پر زور دیا گیا اور ان تمام عناصر کو جو اس نسل میں داخل ہو کر اسے آلودہ کر رہے تھے، ان سے نجات پانے کا نظریہ ابھرا، جس کی وجہ سے یہودیوں اور خانہ بدوشوں کا قتل عام ہوا۔ ہٹلر برطانوی امپیریل ازم سے بڑا متاثر تھا کہ جس نے برصغیر ہندوستان کو غلام بنا رکھا تھا، اس کے نزدیک یہ سفید اقوام کی برتری کا ایک ثبوت تھا۔ وہ خود سلاؤ نسل کے لوگ جو مشرقی یورپ اور روس میں تھے ان کو غلام بنانے کا منصوبہ رکھتا تھا۔

اقوام کی نسلی برتری کے ساتھ ہی، ہربرٹ اسپینسر نے سوشل ڈارون ازم کے نظریہ کے تحت ایک دلیل اور دی۔ وہ یہ کہ ہر معاشرے میں دو قسم کے لوگ ہوتے ہیں طاقت ور اور کمزور۔ چونکہ طاقت ور لوگوں میں زندہ رہنے کی توانائی ہوتی ہے اس لئے ان کا حق ہے کہ وہ کمزور لوگوں پر حکومت کریں۔ چونکہ یہ فطرت کا قانون ہے کہ کمزور اپنے وجود کو برقرار نہیں رکھ سکتے ہیں، اس لئے ریاست کا کام نہیں ہے کہ ان لوگوں کو باقی رکھنے یا ان کے وجود کو برقرار رکھنے کے لئے قوانین بنائیں اور اصلاحات کریں۔ ریاست کا کام ویلفیئر کا نہیں ہے، کیونکہ کمزور لوگ جو معاشرے کے لئے بوجھ ہوتے ہیں، ان کی زندگی کو طوالت نہ دی جائے، ایسے لوگ اگر ماحول اور حالات کا مقابلہ نہیں کر سکتے ہیں تو ان کو ختم ہو جانا چاہئے۔

اس کا یہ نظریہ آمرانہ حکومتوں، اور امراء کے طبقہ کے لئے موثر ہتھیار تھا کہ جو اس کی بنیاد پر عام لوگوں پر اپنا تسلط قائم رکھنا چاہتے تھے۔

سوشل ڈارون ازم کے اس نظریہ کو دو نظریات نے چیلنج کیا۔ اقوام عالم میں سفید فام لوگوں کی برتری کو ایشیا اور افریقہ میں ابھرتی قوم پرستی نے زبردست صدمہ سے دوچار کیا، کیونکہ قوم پرستی کے جذبہ کے تحت یہ اقوام متحد ہوئیں اور انہوں نے سفید آقاؤں کے خلاف آزادی کی تحریکیں شروع کیں، جو بالآخر کامیاب ہوئیں، اور سفید فام اقوام اپنی تمام طاقت اور قوت کے باوجود کامیاب نہیں ہو سکیں۔ اس نے ان کی برتری اور افضلیت کے نظریہ کو سخت نقصان پہنچایا۔

سوشل ڈارون ازم نے معاشرے کے کمزور، ناتواں اور بے بس لوگوں کو جمہوریت، جمہوری اداروں اوراقدار کے ذریعہ ایک نئی طاقت دی، اورانہیں وہ ہتھیاراور ذرائع فراہم کئے کہ جن کی بنیاد پر انہوں نے اپنی کمزوری کو طاقت میں بدل دیا۔ ووٹنگ کے حق نے انہیں، یہ موقع دیا کہ نہ صرف وہ اپنے حکمرانوں کا انتخاب کریں، بلکہ اگر وہ نااہل ثابت ہوں تو اگلے الیکشن میں انہیں اقتدار سے محروم بھی کر دیں۔ اس کے علاوہ ہڑتال، جلسہ، جلوس، بھوک ہڑتال، اور دیگر ذرائع کے ذریعے انہیں اپنے مطالبات پیش کرنے کا حق ملا۔ لہٰذا جمہوریت نے طاقت اور کمزور کے تصور کو بدل کر رکھ دیا۔ اب یہ عوامی نمائندے تھے کہ جن کا فرض تھا کہ وہ ریاست کو عوامی فلاح کے لئے استعمال کریں۔

بدقسمتی سے پاکستان میں سوشل ڈارون ازم اب بھی، جمہوریت کے باوجود کسی نہ کسی شکل میں موجود ہے۔ ریاست پر بااثر طبقہ کا تسلط ہے جو اس کی طاقت کو اپنے مفادات کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ عوام اگر ہڑتال کرتے ہیں، مطالبات کے لئے سڑکوں پر آتے ہیں، تو یہ فوج اور پولیس کے ذریعہ ان کو کچل کر رکھ دیتے ہیں۔ اس لئے یہ اپنی طاقت کو برقرار رکھنے کے لئے تشدد اور جبر کو استعمال کرتے ہیں، اور جمہوری اداروں کو اپنے تسلط میں رکھتے ہوئے عوام کو ان سے محروم رکھتے ہیں۔

دوسرے معاشرے میں جاگیردار اور قبائلی سردار ہاریوں، کسانوں اور مزارعوں کو قابو میں رکھنے کے لئے طاقت کو استعمال کرتے ہیں، اور انہیں موقع نہیں دیتے کہ وہ اپنے حقوق کو حاصل کریں۔

ان دونوں صورتوں میں پاکستان میں طاقت ور لوگ عوام کو کمزور رکھے ہوئے ہیں اور انہیں کسی قسم کا تحفظ فراہم نہیں کرتے ہیں۔ نہ ہی ان کے حق میں قانون سازی ہوتی ہے اور نہ ہی اصلاحات کا نفاذ ہوتا ہے۔

دوسری جانب امریکی اور یورپی افضلیت ہمارے حکمراں طبقوں کو کم تری کا احساس دلاتی رہتی ہے، اس وجہ سے ان میں نہ تو اتنی اہلیت ہے، نہ صلاحیت کہ وہ اس نسلی برتری کی مزاحمت کرتے ہوئے، خود کو آزاد کر سکیں۔

علم اور معاشرہ

تاریخ کے مطالعہ کے بعد ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ انسانی معاشرہ سادگی سے پیچیدگی کی طرف جارہا ہے۔لیکن اس کے ساتھ ہی علم کا پھیلاؤ ہی ہے کہ جو اس پیچیدگی اور اس الجھن کو سمجھنے کی کوشش کر رہا ہے۔انسان میں ابتداء ہی سے تجسس اور جاننے کا احساس رہا ہے، وہ اپنے اردگرد کی دنیا کو سمجھنے کی کوشش کر رہا ہے۔اس تحقیق اور جستجو میں یونانی فلسفیوں کا کردار اہم رہا ہے، مثلاً ابتداء میں یہ سوال تھا کہ آخر یہ دنیا کیسے وجود میں آئی؟ اس کا جواب آیونین (Ionian) فلسفیوں نے دیا، تھیلیز (Thelese) نے کہا کہ یہ دنیا پانی سے وجود میں آئی ہے، مگر اس کے شاگردوں نے آگے چل کر اس کو چیلنج کیا اور کہا کہ یہ آگ، اور ہوا سے بنی ہے۔ان کے یہ نظریات ان کے مشاہدات پر مبنی تھے، اور کوشش تھی کہ اس دنیا کے بارے میں حقائق کا پتہ چلایا جائے۔ ہیراک لی ٹس (Herakleitus) نے کہا کہ اس دنیا میں مسلسل ہر وقت تبدیلی کا عمل جاری ہے، یہ جامد اور ساکت نہیں، اس کا مشہور مقولہ ہے کہ ''آپ ایک ہی دریا میں دوبارہ پیر نہیں رکھ سکتے ہیں۔''

آیونین فلسفیوں کے بعد تحقیق اور جستجو کا مرکز ایتھنز کا شہر ہو جاتا ہے کہ جہاں سقراط بازاروں اور چوراہوں پر لوگوں سے سوالات کرتا نظر آتا ہے۔ چونکہ اب معاشرہ منظّم ہو گیا ہے، اس کا سیاسی اور سماجی نظام ہے، اس لئے یہ سوالات ابھر رہے ہیں کہ معاشرے کو کن بنیادوں پر برقرار رکھا جاسکتا ہے۔اس کے لئے اخلاقی اقدار کی ضرورت ہے کہ جو لوگوں کو معاشرے سے منسلک رکھتے ہوئے انہیں انصاف اور پُرامن زندگی دیں۔ اس لئے سقراط کی تعلیمات میں نیکی، انصاف، پرہیزگاری، اور ایمانداری برقرار ہے۔ اس کے خیالات کو افلاطون نے اپنی تحریروں میں بیان کیا ہے۔

ایتھنز کی شہری ریاست میں تین قسم کے سیاسی نظام رہتے تھے، ایک جمہوریت، لیکن یہ

محدود تھی، اس میں غلام، عورتیں اور غیر ملکی شامل نہیں تھے۔ دوسرا آمریت (Tyranny) جس میں اختیارات ایک فرد کے پاس آجاتے تھے۔ تیسرا چند سری (Oligarchy) بھی تھا۔ جمہوری نظام کو تقویت دینے میں سوفسٹس (Sophists) طبقہ کا اہم کردار تھا، جو سیاستدانوں کو فن خطابت، اور منطق کی تعلیم دیتے تھے تاکہ وہ عوام کی اسمبلی میں اپنا مقدمہ موثر طور پر پیش کرسکیں۔

افلاطون، جمہوریت کا مخالف تھا، کیونکہ اس کے استاد سقراط کو اسی جمہوری دور میں موت کی سزا دی گئی تھی۔ اس لئے وہ اس پر تنقید کرتے ہوئے کہتا ہے کہ اس نظامِ حکومت میں سیاستدان اپنی خطابت کے ذریعہ لوگوں کو بیوقوف بناتے ہیں، ان سے جھوٹے وعدے کرتے ہیں اور ہر صورت میں اقتدار پر قبضہ چاہتے ہیں۔ اس کا اعتراض یہ بھی ہے کہ سیاستدانوں کے مقاصد محدود ہوتے ہیں، چونکہ وہ مستقل طور پر اقتدار میں نہیں رہتے ہیں۔ اس لئے وہ دیرپا منصوبوں پر عمل نہیں کرتے ہیں۔ اس کا اعتراض یہ بھی ہے کہ جمہوریت میں اوسط ذہن کے لوگ اقتدار میں آتے ہیں، جبکہ ذہین افراد اس نظام میں ایک طرف کردیئے جاتے ہیں۔

جمہوریت پر اس تنقید کے بعد اس نے اس نظام کے بارے میں اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ تاکہ اس کی خرابیوں کو دور کیا جا سکے۔ اول وہ کہتا ہے کہ نظامِ حکومت کو چلانے کے لئے علیحدہ سے ایک طبقہ ہو، جنہیں گارڈین آف ریپبلک کہتا ہے۔ یہ طبقہ ایک مشترک خاندان کی حیثیت سے زندگی گذارے، جس میں بچے سب کے ہوں، تاکہ نظام میں اقربا پروری کی گنجائش نہ ہو۔ اس طبقہ کے پاس کوئی جائیداد نہ ہو، تاکہ دولت اکٹھی کرنے کا جذبہ ہی نہ ہو۔ پھر وہ کہتا ہے کہ عورتوں کو بھی حکومت کرنے کا پورا پورا حق ہونا چاہئے اور حکومت کے سربراہ کو فلسفی ہونا چاہئے۔ افلاطون کے یہ خیالات اس کے اپنے عہد اور آنے والے دور کے لئے بڑے انقلابی تھے۔

ارسطو نے جو بیس سال تک افلاطون کا شاگرد رہا تھا، اس کے نظریات و خیالات سے اختلاف کیا اور سیاست، شاعری، اخلاقیات، طبیعات، مابعدالطبیعات اور بہت سے دوسرے علوم پر لکھا۔ اس نے سب سے پہلے لبرل علوم کی اصطلاح کو استعمال کیا۔ اس کے فلسفہ کا اثر نہ صرف اس کے زمانہ میں ہوا، بلکہ بعد میں عیسائیت نے اس کے افکار کو اپنی تعلیمات میں شامل کرکے ایک نئی زندگی دیدی، اور عہدِ وسطیٰ میں اس کا فلسفہ نہ صرف عیسائی دنیا میں، بلکہ مسلمانوں میں بھی مقبول رہا۔

اس دوران یونان میں کئی فلسفیانہ تحریکیں ابھریں، ان کا مقصد یہ تھا کہ انسان کس طرح خوشی و مسرت کی زندگی گزارے، اس کے لئے ضروری تھا کہ وہ دولت اور جائیداد کے حصول میں اپنی توانائی صرف نہ کرے، دوسرے وہ ہر مسئلہ کو شک کی بنیاد پر دیکھے اور کسی صداقت کو آفاقی تسلیم نہیں کرے۔ ایک مکتبہ فکر کے تحت انسان کو سادہ زندگی گزارنی چاہیئے، اور اپنی آسائش اور آرام کے لئے کسی چیز کی خواہش نہیں کرنی چاہیئے، ایک اور فرقہ کے فلسفیوں کا کہنا تھا کہ فرد کو معاشرے میں رہتے ہوئے قانون اور ضابطہء اخلاق کی پابندی کرنی چاہیئے۔

رومیوں نے یونان کے فلسفیانہ ورثہ کو اختیار کر لیا۔ مگر انہوں نے ایک بڑی امپائر کی بنیاد ڈالی، اس لئے انہیں ایسے قوانین کی ضرورت تھی جو بڑھتے ہوئے سماجی، معاشی اور کلچرل مسائل کو حل کر سکیں۔ اس لئے رومیوں نے ایک جامع اور مفصل قانون کی تشکیل کی۔ اس کے علاوہ جب ان کا واسطہ دوسری مفتوح قوموں سے ہوا تو انہوں نے ان کے رسم و رواج اور ان کی عادات و مزاج کا مطالعہ کر کے ان سے سیکھا اگرچہ انہوں نے خود کو مہذب اور مفتوح قوموں کو غیر مہذب کیا، مگر تعلق کی وجہ سے ان میں وسعت نظری پیدا ہوئی۔

رومی زوال کے بعد، جب یورپ میں عیسائیت کا غلبہ ہوا، اور معاشرے پر چرچ کا تسلط ہوا، تو علم کا مقصد یہ ٹھہرا کہ چرچ اور اس کی تعلیمات کو سچا ثابت کیا جائے لہٰذا اس دور میں فلسفہ، الٰہیات کا ماتحت ہو گیا، اس کے علم کو ایک جگہ ٹھہرا دیا، اور اس کا واحد مقصد یہ رہا کہ لوگوں میں عیسائیت کی تعلیمات کو فروغ دیا جائے۔

چودھویں صدی میں، جسے ہم یورپ میں ریناساں، یا احیاء العلوم یا نشاۃ ثانیہ کا عہد کہتے ہیں۔ اس عہد میں دانشوروں کا ایک گروہ پیدا ہوا، جو خود کو انسان دوست یا (Humanists) کہتے تھے۔ انہوں نے علم کو چرچ کی قید سے آزاد کر دیا اور نصاب تعلیم کو تبدیل کرتے ہوئے اس میں قانون و فن خطابت کے ساتھ ساتھ ادب، موسیقی، فلسفہ، تاریخ، اور جغرافیہ کو بھی شامل کیا۔ اس نے علم کی سرحدوں کو آگے بڑھایا۔ یہ علوم اسی وجہ سے ہیومنٹیز (Humanities) کہلاتے ہیں۔

ایک مرتبہ جب علم چرچ کی قید سے آزاد ہو گیا تو اب اس میں تبدیلی کی تحریکیں شروع ہوئیں۔ سترہویں صدی میں یورپ میں سائنسی انقلاب آیا، جس نے تجزیہ اور تجربہ کی اہمیت پر زور دیا۔ اشیاء اور مسائل کو دلیل کی بناء پر جانچنے اور پرکھنے کی ابتداء ہوئی۔ اٹھارہویں صدی میں

روشن خیالی کی تحریک کا آغاز ہوا۔ جس میں علم کی بنیاد سائنس اور دلیل پر ہوئی، اور اس کے ساتھ ہی یہ تاثر ابھرا کہ دنیا برابر ترقی کر رہی ہے۔ اس تحریک کے نتیجہ میں انگلستان میں معاشی نظریات تخلیق ہوئے، آدم اسمتھ، ریکارڈو اور مالتھوس نے جن معاشی نظریات کو پیدا کیا، اس کے نتیجہ میں جدید سرمایہ داری کا آغاز ہوا۔ فرانس میں فلوسوف (Philosophs) نے سیاسی اور سماجی مسائل پر غور کیا، جبکہ جرمنی میں فلسفہ اور تاریخ میں نئے افکار کی ابتداء کی۔ ان تینوں نظریات نے مل کر یورپ میں جدید علم کو فروغ دیا۔

علم میں انقلابی تبدیلیاں لانے میں تین افراد کا اہم حصہ ہے، ڈارون، کارل مارکس، اور فرائڈ۔ ان کے نظریات نے فرد اور معاشرے کو سمجھنے میں مدد دی۔

یورپ میں علمی تبدیلیاں نہ صرف یونیورسٹیوں کے اساتذہ نے کیں، بلکہ یونیورسٹی سے باہر عام لوگوں نے اپنے خیالات و نظریات سے علم کے پھیلاؤ میں حصہ لیا۔

پہلی اور دوسری جنگوں کے بعد یورپ میں نئی تحریکیں شروع ہوئیں، جن میں ڈاڈا ازم، وجودیت، ساختیات، جدیدیت اور مابعد جدیدیت کی تحریکیں اہم ہیں۔

اب جیسے جیسے معاشرہ پیچیدہ ہو رہا ہے۔ ٹکنالوجی اس کی ساخت کو بدل رہی ہے انسانی عادات، مزاج اور رجحانات میں تبدیلی آ رہی ہے، اسی طرح سے علم اپنے مشاہدات اور تجربات کی مدد سے نئے مسائل کا حل تلاش کر رہا ہے۔

پاکستان کا المیہ یہ ہے کہ یہاں علم ایک جگہ جامد ہو کر رہ گیا ہے، اور اس میں جو تبدیلیاں آ رہی ہیں، ان سے ناواقف ہیں۔ اس لئے پاکستان کی سوسائٹی تو بدل رہی ہے، مگر اس کو سمجھنے کے لئے ہمارے پاس علم کے وہ ہتھیار اور اوزار نہیں کہ جن کی مدد سے ان پیچیدگیوں کو سمجھ سکیں۔ بدقسمتی سے نیا علم نہ تو یونیورسٹیوں کے اندر پیدا ہو رہا ہے، اور نہ ہی یونیورسٹیوں سے باہر، دانشور جدید رجحانات کو سمجھ رہے ہیں، اس صورتِ حال میں یونیورسٹیوں کے نصاب اور ان کے ماحول کو بدلنے کی ضرورت ہے، کیونکہ جب تک علم معاشرے کی تبدیلیوں کا ساتھ نہیں دے گا اس وقت تک معاشرہ مسائل اور الجھنوں کا شکار رہے گا۔

اخلاقی قدریں اور انسانی عمل

آج کل ایک بات کو بار بار دہرایا جاتا ہے کہ سیاست میں کوئی اخلاقی قدریں نہیں ہوتی ہیں، اس میں قومی، ملکی یا ذاتی مفادات ہوتے ہیں کہ جو سیاست کو کامیاب بناتے ہیں۔ اسی طرح کہا جاتا ہے کہ معیشت کا بھی اخلاقی اقدار سے کوئی تعلق نہیں ہوتا ہے اس میں فائدے اور منافع کو دیکھا جاتا ہے۔ اخلاق سے مبرا سیاست اور معیشت کو جرمن اصطلاح میں حقیقی سیاست یا Real) (Politics کہہ کر اس مفہوم کا اظہار کیا جاتا ہے، یا اسے حقیقت سے تعلق رکھنے والا رویہ یا (Pragmatism) بھی کہا جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں عام طور سے، قدیم عہد کے مفکر کوٹلیہ کی ارتھ شاستر کا ذکر ہوتا ہے کہ جس نے موریہ بادشاہ کو مشورہ دیا تھا کہ سلطنت کی توسیع اور آزاد قبائل کو اس کے دائرہ تسلط میں لانے کے لئے ہر ممکن ذرائع کو اختیار کریں، جن میں عورت، شراب، زہر، اور دولت کا استعمال کر کے اپنے مقاصد کی تکمیل کرنی چاہئے۔ ریناساں دور کے مفکر میکاولی نے بھی اپنی کتاب ''پرنس'' (Prince) میں اس کا اظہار کیا ہے کہ حکمراں یا سیاستداں کو اپنے مقصد کے حصول کے لئے جھوٹ، فریب اور دھوکہ دہی کو استعمال کرنا چاہئے۔

تاریخ میں ہم دیکھتے ہیں کہ جن حکمرانوں نے ان اصولوں پر عمل کیا اور اپنے مقصد میں کامیاب ہو گئے۔ تاریخ دانوں نے ان کے غیر اخلاقی اقدامات کو نظر انداز کر کے ان کی کامیابی کو، ان کی ہوشیاری، دانش مندی، اور چالاکی کو قرار دیتے ہوئے ان کی تعریف و توصیف کی۔

جب ہم تاریخ میں حکمرانوں اور سیاستدانوں کے غیر اخلاقی اقدامات کو دیکھتے ہیں تو اس میں طاقت ور اور کمزور کا کردار بھی نظر آتا ہے۔ جو قومیں طاقت ور ہوتی ہیں طاقت کا یہ نشہ انہیں تمام اخلاقی اقدار سے آزاد کر دیتا ہے اور وہ یہ سمجھتی ہیں کہ کمزور اقوام کا فرض ہے کہ ان کی اطاعت کریں، اور ان کے غیر اخلاقی اقدامات کو چیلنج نہیں کریں۔

ہندوستان میں جب ایسٹ انڈیا کمپنی، فوجی اور معاشی طور پر طاقت ور ہوگئی تو اس نے ہندوستان کی ریاستوں سے اپنی مرضی کے معاہدے کئے، اور جب چاہا ان معاہدوں کی خلاف ورزی کرتے ہوئے، اپنے مفادات کو پورا کیا۔ اودھ کی ریاست سے ان کے معاہدے ہوتے رہے، لیکن جب ان کی پالیسی کے مطابق، اس پر قبضہ کرنا تھا تو انہوں نے ان تمام معاہدوں کو ایک طرف رکھ دیا۔ واجد علی شاہ روتے رہے اور یاد دلاتے رہے کہ یہ معاہدے کی خلاف ورزی ہے مگر ان کی اس لئے نہیں سنی گئی کہ وہ کمپنی کے مقابلے میں کمزور تھے اور اس قابل نہیں تھے کہ اس سے مقابلہ کر سکے، اس لئے بالآخر انہیں اودھ کی ریاست سے دستبردار ہونا پڑا۔

یہی صورتِ حال کمپنی اور مغل بادشاہ کے ساتھ معاہدوں کی تھی، جیسے جیسے کمپنی کا اقتدار مضبوط ہوا، اور مغل بادشاہ ان پر انحصار کرنے لگا، انہوں نے آہستہ آہستہ معاہدوں میں تبدیلی کرنا شروع کی اور آخر میں تو 1857ء سے پہلے وہ اس معاہدہ میں کامیاب ہو گئے کہ بہادر شاہ کا جانشین قلعہ چھوڑ دے گا اور شہنشاہ کے خطاب کو بھی استعمال نہیں کرے گا۔ جب دوسری پارٹی کمزور ہو، اور اس میں بغاوت و مزاحمت کی قوت و جذبہ نہ ہو تو وہ ان ذلت آمیز شرائط کو تسلیم کرتی رہتی ہے اور بالآخر ختم ہو جاتی ہے۔

یہی صورتِ حال 19 صدی میں چین کے ساتھ تھی، جب ایسٹ انڈیا کمپنی نے اس پر زبردستی افیم کی تجارت کر کے وہاں کے لوگوں کو اس کا عادی بنایا، تو چین کی کمزور حکومت نے مزاحمت کی تو اس پر حملہ کر کے اور شکست دے کر اس سے ذلت آمیز معاہدوں پر دستخط کرائے، اور آہستہ آہستہ اس کے اندرونی معاملات میں دخل اندازی کر کے اس کو اور کمزور کیا۔ اس کی بندرگاہوں پر قبضے کئے، اور اس کی آزادی کو ختم کر کے وہاں اپنا سیاسی تسلط قائم کیا۔

اس لئے سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا سیاسی کامیابی کے لئے غیر اخلاقی اقدار کا سہارا لینا ضروری ہے؟ کیونکہ آج کی اس جدید دنیا میں طاقت ور اقوام اس پر عمل پیرا ہیں۔ اگر طاقت کے ذریعہ اخلاقی اقدار کو پامال کر کے کمزور ملکوں اور اقوام پر اپنا تسلط قائم کرنا ہے تو کیا پھر کمزور اقوام اور ملکوں کو بھی طاقت کے حصول کے لئے اپنے ذرائع کو استعمال کرنا چاہئے تاکہ وہ طاقت کے ذریعہ اپنا تحفظ کریں، یہ وہ اہم سوالات ہیں کہ جن کا جواب دینا مشکل ہے۔

اگر فوجی طاقت ہی قوموں کے تحفظ کا واحد ذریعہ ہے تو کیا یہ رجحان دنیا کو جنگوں اور قتل و

غارت گری میں الجھا کر اس کی خوش حالی کے خاتمہ کا باعث نہیں ہو جائے گا؟

موجودہ دور میں طاقت ور اس کی غیر اخلاقی اقدار کے مقابلہ میں عدم تشدد کی پالیسی کو اختیار کیا گیا، مگر یہ پالیسی ہندوستان میں انگریزی حکومت کے مقابلہ میں تو کامیاب رہی مگر کیا یہ دوسرے ملکوں کے تصادم میں کامیاب ہوگی؟ اسرائیل کے جارحانہ غیر اخلاقی حملوں اور قتل عام کے خلاف فلسطینیوں کی مسلح جدوجہد نا کام ہوگئی کیونکہ اسے کسی عرب ملک سے حمایت نہیں مل سکی، کیونکہ وہ ایک جمہوری اور آزاد فلسطینی ریاست سے خوفزدہ ہیں، جو ان کی آمریت اور بادشاہت کے لئے خطرہ ہوگی، اس لئے کیا فلسطین اب عدم تشدد پر عمل کر کے اسرائیل کے غیر اخلاقی اقدامات کا مقابلہ کر سکیں گے؟

جنوبی افریقہ میں اپارتھائڈ حکومت اس وجہ سے اقتدار چھوڑنے پر مجبور ہوئی کہ اسے یورپ و امریکہ کی مدد نہیں رہی تھی اور اس کے بغیر اس کے لئے حکومت کرنا مشکل تھا۔ اس لئے اس نے اپارتھائڈ کی غیر اخلاقی حکومت کا خاتمہ کیا۔

سماج کے اندر بھی اخلاقی اقدار کو طاقت ور اور کمزور طبقے اپنے مقاصد کے لئے استعمال کرتے ہیں۔ جرمن فلسفی نیتشے کے مطابق رحم دلی، ہمدردی اور ترس کے جذبات کو طاقت ور طبقے اپنے تسلط کے لئے بروئے عمل لاتے ہیں کیونکہ کسی پر ترس کھانا، کسی کے ساتھ ہمدردی اور رحم دلی کے ساتھ پیش آنے کا مطلب ہے کہ طاقت ور طبقے اور افراد ان قدروں کے ذریعے اپنی برتری اور افضلیت کو قائم کرتے ہیں، کیونکہ ترس اسی پر کھایا جاتا ہے جو بے بس اور مجبور ہوتا ہے۔ رحم دلی کے ساتھ اس کے ساتھ پیش آیا جاتا ہے جو کہ کمزور اور محتاج ہوتا ہے۔ اس لئے یہ اخلاقی اقدار حکمراں اور طاقت ور طبقوں کو استحکام بخشتی ہیں۔

ان کے مقابلہ میں کمزور طبقے انصاف، ایمانداری اور دیانت کی اقدار کو استعمال کر کے سماج میں اپنا تحفظ چاہتے ہیں تاکہ ان اقدار کی بنیاد پر وہ سماج میں توازن پیدا کر کے طاقت کے اثر کو کمزور کر سکیں اور اپنے لئے کوئی جگہ بنا سکیں۔ اس لئے انصاف کا تقاضہ ہمیشہ کمزور کرتا ہے کیونکہ طاقت ور افراد کو اس کی ضرورت نہیں ہوتی ہے۔

اسی طرح معیشت کی بنیاد منافع کے حصول پر ہوتی ہے، اس مقصد کے لئے سرمایہ دار، تاجر اور صنعت کار ہر اخلاقی اقدار کو نظر انداز کر کے منافع کی خاطر آگے بڑھتا ہے۔ امریکہ کے ابتدائی

دور میں یہ سرمایہ دار ڈاکو سرمایہ دار یا (Baron Bandits) کہلاتے تھے جو اپنے سرمایہ اور تجارت کو فروغ دینے کے لئے اپنے مقابل سرمایہ دار یا افراد کو قتل کرانا، دھمکی یا دھوکہ سے ان کی صنعت کو تباہ کرنا شامل تھا۔ سرمایہ دارانہ نظام کے اندر لالچ اور طمع کی غیر اخلاقی قدریں پنہاں ہوتی ہیں، اور اس میں مقابلہ کے نام پر راستے میں آنے والی ہر چیز کو ختم کرنے کا جذبہ ہوتا ہے، تاکہ آخر میں وہ بلا مقابلہ کامیاب ہو جائے اور تمام منافع کو حاصل کر لے۔

اس وجہ سے سرمایہ دار طبقے میں ایمانداری، دیانت، اور انصاف کی کوئی گنجائش نہیں ہوتی ہے۔ اگرچہ کمزور لوگ یعنی مزدور اور ملازم ہمیشہ ان اقدار پر اصرار کرتے ہیں، مگر انہیں نظر انداز کر دیا جاتا ہے، اور منافع کا جذبہ ان پر غالب آ جاتا ہے۔

اگرچہ مذہب اور مفکرین کی جانب سے اخلاقی اقدار پر زور دیا جاتا ہے، مذہب آخرت کا خوف دلاتا ہے تاکہ ان اقدار پر عمل ہو، مفکرین سیکولر نقطۂ نظر سے ان اقدار پر عمل کرنے پر اس لئے اصرار کرتے ہیں کہ ان پر عمل ہونے کی صورت میں معاشرے میں طبقات کے مفادات میں توازن پیدا ہوتا ہے، جرائم میں کمی ہوتی ہے، سماج میں خوش حالی اور امن ہوتا ہے، جس کی وجہ سے تمام افراد پُرمسرت زندگی گزار سکتے ہیں۔ مگر مذہب اور مفکرین و فلسفیوں کے نظریات طاقت ور طبقوں اور افراد کے ذہن کو بدلنے میں پوری طرح سے کامیاب نہیں ہوئے ہیں اور اخلاقی اقدار اقوام میں اور سماج کے طبقوں میں توازن کو قائم کرنے میں پوری طرح سے موثر ثابت نہیں ہوئی ہے۔

آزادخیالی

فرانسیسی انقلاب نے جہاں سیاسی اور سماجی تبدیلیاں کیں وہیں اس نے نظریات وافکار کو بھی جنم دیا۔فرانس کی نیشنل اسمبلی میں جواراکین دائیں جانب بیٹھے ہوتے تھے وہ قدامت پسند نظریات کے حامل تھے جبکہ بائیں جانب بیٹھنے والے اراکین انقلابی اور Radical نظریات کے حامی تھے۔اس وجہ سے دائیں اور بائیں بازو کی اصطلاحات ان دونظریات کا اظہار ہیں۔ان دونوں جماعتوں میں قدامت پرستی اور ترقی پسندانہ نقطہ ہائے نظر کا فرق تھا۔

ان دونظریات کے ساتھ ساتھ ایک تیسرا نظریہ حالات کی مطابقت سے پیدا ہوا۔ جوآزاد خیالی (Liberalism) کہلاتا ہے۔لبرل خیالات سے تعلق رکھنے والے دائیں اور بائیں بازو سے علیحدہ ہوکر سیاست میں ایک متبادل راستہ اختیار کرتے تھے۔ یہ انقلاب کے حامی تو نہیں تھے اور نہ ہی ماضی کی تمام روایات یا اداروں کو ختم کرنا چاہتے تھے مگر ان کا نظریہ تھا کہ معاشرے کی ترقی میں اگر کوئی ادارہ یا روایت حائل ہو تو اس رکاوٹ کو دور کردینا چاہئے۔ یہ ایک طرح سے ماضی سے رشتہ بھی رکھنا چاہتے تھے مگر مستقبل میں ترقی کے حامی تھے۔

دوسری جانب یہ معاشرے کو انقلابی طور پر تبدیل کرنا نہیں چاہتے تھے لیکن معاشرے کی ترقی اور فرد کی آزادی کے لئے ان کا مطالبہ تھا کہ معاشرے میں مکمل آزادیءرائے ہوتا کہ ایک فرد اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا اظہار کر سکے۔اس کی راہ میں کسی بھی قسم کی سیاسی یا سماجی رکاوٹیں نہ ہوں۔ یہ سماج میں بنیادی انسانی حقوق کے قائل تھے۔

انگلستان میں انیسویں صدی میں افادیت پرستی (Utilitaria) کی تحریک ابھری جس نے لبرل خیالات کو فروغ دیا۔اس تحریک کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ اصلاحات کے ذریعہ معاشرے کو تبدیل کیا جائے اور ایسا ماحول پیدا کیا جائے کہ جس میں زیادہ سے زیادہ لوگ خوشی اور مسرت

حاصل کر سکیں۔اس تحریک کے خیال میں وہ روایات جو کہ فرسودہ ہو چکی ہیں انہیں ختم کر کے نئی روایات کی بنیاد ڈالنی چاہیئے تا کہ معاشرہ ترقی کر سکے۔اس تحریک کا سب سے زیادہ زور قانونی اصلاحات پر تھا۔وہ قانون کو معاشرے کی اصلاح اور تبدیلی کے لئے ضروری خیال کرتے تھے جو انسانی ذہن کو بدلنے میں مددگار ہوتا ہے۔

اس کے مقابلے میں فرانس میں آزاد خیالی (Liberalism) کی تحریک نے اس وقت مقبولیت حاصل کی جب انقلاب کے بعد وہاں دوبارہ سے بادشاہت کا نظام قائم ہوا۔لبرل یا آزاد خیال لوگ بادشاہت کے نظام میں تبدیلی چاہتے تھے۔وہ مطلق العنان بادشاہ کے خلاف تھے اور بادشاہت کو دستور کا پابند کرنا چاہتے تھے تا کہ اس کے اختیارات کو قانون کا پابند کر دیا جائے۔

لبرلزم یا آزادخیالی کی اس تحریک نے یورپ کے سماج میں ایک اوراہم تبدیلی کی،اس نے عورتوں کو جواب تک تمام حقوق سے محروم تھیں ان میں بیداری کی لہر پیدا کرتے ہوئے یہ مطالبہ کیا کہ عورتوں کو بھی مردوں کی طرح برابر کے حقوق دیئے جائیں۔ اس نے یورپ میں Faminism کی تحریک کو جنم دیا۔

لبرلزم کے نظریات کو اس وقت اور زیادہ تقویت ملی جب John Stuart Mill نے اپنی کتاب (On Liberty) یا آزادی میں اس کو فلسفیانہ شکل دی۔اس کے نزدیک سماج میں دو قسم کی آمریت ہوتی ہیں،ایک اوپروالی (Tyranny from above) جس میں ریاست اس کے ادارے اور حکمراں طبقے پابندیاں عائد کر کے فرد کی تخلیقی صلاحیتوں کو ابھرنے نہیں دیتے ہیں، مثلاً ایسے قوانین بنائے جاتے ہیں کہ جو اہم شخصیتوں یا اداروں پر تنقید نہیں کرنے دیتے۔دوسری جانب معاشرے میں اکثریت کی آمریت (Tyranny of majority) ہوتی ہے۔جس میں اکثریت اپنے نظریات کے خلاف کسی تنقید کو برداشت نہیں کرتے ہیں اور آزادیٔ رائے کو خوف اور دہشت کے ذریعہ ختم کر دیتے ہیں۔

Mill کا خیال تھا کہ جب تک فرد ان دونوں آمریتوں سے آزاد نہیں ہوگا اس وقت تک اس کی تخلیقی صلاحیتوں کو ابھرنے کا موقع نہیں ملے گا۔وہ اس کا بھی حامی تھا کہ تعلیم کو ریاست سے آزاد کرایا جائے کیونکہ ریاست تعلیم کے ذریعہ نوجوان نسلوں پر اپنے خیالات مسلط کرتی ہے وہ ایسا

نصاب تیار کرتی ہے جو حکمراں طبقوں کے مفادات میں ہوتا ہے۔ یہ آنے والی نسلوں کو ذہنی طور پر مفلوج بنا دیتا ہے۔

پاکستان میں آزاد خیالی کے نظریہ کو منفی معانوں میں استعمال کیا جاتا ہے۔ قدامت پرست طبقے اس اصلاح کو بطورِ طنز استعمال کرتے ہیں مثلاً اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ وہ بڑے آزاد خیال انسان ہیں جس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ معاشرے کی روایات سے منکر ہیں، اور ان سے بغاوت کر کے حالات کے مطابق نئی روایات کی داغ بیل ڈالنا چاہتے ہیں۔ عورتوں کو آزاد خیال کہہ کر یہ ثابت کیا جاتا ہے کہ وہ اپنے روایتی مقام سے انحراف کر رہی ہیں جو معاشرے کے لئے برائی کا سبب ہے۔

دوسری جانب لبرل یا آزاد خیال لوگوں کو پاکستان کے معاشرے میں ریاست کی آمریت اور معاشرے کی اکثریتی آمریت دونوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے یہی وجہ ہے کہ ہمارے معاشرے میں تخلیقی کاموں کا فقدان ہے۔ سماجی علوم کے ماہرین، آرٹسٹ، ادیب، شاعر اور فنکاران پابندیوں کی وجہ سے اپنی تخلیقی صلاحیتوں کا اظہار نہیں کر سکتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ہمارے معاشرے میں نئے نظریات و افکار کی گنجائش نہیں ہے اور معاشرہ قدامت پرستی کی زنجیروں میں جکڑا ہوا ہے۔

پاکستانی معاشرے کا المیہ یہ ہے کہ اس میں اکثریتی آمریت ریاستی آمریت سے زیادہ طاقت ور ہے۔ ریاستی آمریت کا تعلق قوانین سے ہوتا ہے کہ جن کا مقابلہ کیا جا سکتا ہے مگر اکثریتی آمریت کا تعلق جذبات سے ہوتا ہے اس لئے جب وہ کسی تحریر یا تقریر کو اپنے خیالات کے منافی سمجھتی ہے تو خوف اور دہشت کا سہارا لے کر اسے ختم کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس لئے اکثریتی آمریت معاشرے کے لئے زیادہ خطرناک اور نقصان دہ ہے کیونکہ یہ نہ تو کسی تنقید کو برداشت کرتی ہے اور نہ ہی کسی نئی فکر اور نظریہ کو۔ یہی وجہ ہے کہ ہمارا معاشرہ ذہنی طور پر پست ماندگی کا شکار ہے اور دنیا میں ہونے والی تبدیلیوں سے بیگانہ ہو کر تنہائی کی حالت میں زندگی گزارنا چاہتا ہے۔

کیا اردو علمی زبان بن سکتی ہے؟

کسی بھی زبان میں لکھا جانے والا لٹریچر اس زبان کے بولنے والے لوگوں کے ذہن کی عکاسی کرتا ہے۔اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ ذہنی پختگی کے کس درجہ پر ہیں۔اگر زبان میں نئے الفاظ اور اصطلاحات کا اضافہ رہتا ہے تو اس سے یہ اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ سماج میں نئے خیالات، افکار اور نظریات کو روشناس کرایا جا رہا ہے۔اگر زبان ایک جگہ ٹھہر جائے اور اس کے الفاظ اور اصطلاحات میں جمود آ جائے تو اس سے معاشرے کی پسماندگی کا اظہار ہوتا ہے۔

تاریخ میں زبان کے ذریعہ دانش وروں نے ایک طرف تو خصوصی احساس کو پیدا کیا تو دوسری جانب اس میں تخلیقی لٹریچر پیدا کر کے زبان کو زرخیز بنایا۔انیسویں صدی جرمنی میں جب قوم پرستی کی لہر اٹھی تو اس کے دانشوروں نے جرمن زبان کے ذریعہ قومی شعور کو بیدار کیا۔ انہوں نے ادب، فلسفہ، تاریخ، سائنس اور دوسرے علوم پر کتابیں لکھ کر جرمن زبان کو معیاری زبان کا درجہ دیا۔اس کی دوسری مثال مشرقِ وسطیٰ ہے کہ جہاں بیسویں صدی میں عرب قوم پرستی کی بنیاد عربی زبان تھی۔اس زبان میں تخلیقی ادب پیدا کرنے میں خاص طور سے لبنان کے عیسائی دانشوروں کا حصہ ہے جنہوں نے کوشش کی کہ عربی زبان کو نئے علوم سے مالا مال کیا جائے۔تاکہ عرب قوم پرستی کی جڑیں مضبوط ہوں۔

زبان کو زرخیز بنانے میں دوسرا عنصر یہ ہوتا ہے کہ اس میں ان علوم کی کتابوں کے تراجم کئے جائیں جس کی اس میں کمی ہے۔ چنانچہ جب جاپان میں جدیدیت کا رواج ہوا تو اس کے دانشوروں نے یورپ کی زبانوں سے سائنس، ٹیکنالوجی، سماجی علوم اور ادب کے تراجم کئے۔لیکن اس کے ساتھ انہوں نے ان علوم میں اپنی تحقیق کو بھی جاری رکھا۔تراجم کا کام فارسی زبان میں بھی ہوا جہاں یورپی ادب، تاریخ اور دوسرے سماجی علوم کی اہم کتابوں کو فارسی میں منتقل کیا گیا۔لیکن

محض تر جموں کے ذریعہ کسی زبان کو اہم نہیں بنایا جا سکتا ہے۔ تراجم زبان کو مقروض بنا دیتے ہیں، جب تک کسی زبان میں بنیادی تحقیقی کام نہ ہو اس کے بولنے والوں کی ذہنی ترقی نہیں ہوسکتی ہے۔

اس پس منظر کو دیکھتے ہوئے جب ہم اردو زبان کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں پتہ چلتا ہے کہ اس کی نشو ونما میں دہلی اور لکھنو کی اشرافیہ کا حصہ ہے جس نے فارسی زبان کے زوال کے بعد اس کو اختیار کیا۔ دکن میں جو عوامی زبان ابھر رہی تھی اس کا خاتمہ کر کے اس کو فارسی اور عربی زبانوں سے منسلک کر دیا۔ دوسرے یہ زبان شہروں میں مروج ہوئی جبکہ دیہات کے لوگ اس سے دور رہے۔ ابتدائی دور میں شعر وشاعری اور داستانوں کے ذریعہ لکھاری اپنی ذہانت اور لیاقت کا اظہار کرتے تھے۔ لہٰذا تشبیہات، استعاروں اور زبان آرائی کو تخلیق کا کارنامہ سمجھا جاتا تھا۔ جبکہ فکری اور نظریاتی تحریروں کا رواج نہ ہونے کے برابر تھا۔

اردو زبان میں دوسرا اہم موضوع جس پر کتابیں لکھی گئیں وہ مذہب تھا۔ لہٰذا شعر وشاعری، داستانوں اور مذہبی عقائد نے اردو زبان کو اپنا لیا۔ ان موضوعات پر جو لٹریچر لکھا گیا اس نے ایسی زبان کے بولنے والے ذہن کو بنایا۔

ابتدائی دور میں اردو نثر کو اس قدر پیچیدہ بنا دیا گیا تھا کہ اس کو سمجھنا مشکل تھا۔ انیسویں صدی میں سر سیّد اور ان کے ساتھیوں نے کوشش کی کہ اردو نثر کو پیچیدگی سے نکال کر سادگی کی طرف لایا جائے اور اسے ایک علمی زبان بنایا جائے، لیکن یہ کوشش پوری طرح کامیاب نہیں ہوسکی۔ ایک اور کوشش حیدرآباد دکن میں جامع عثمانیہ کے قیام کے بعد ہوئی کہ جہاں اردو کو ذریعہ تعلیم بنایا گیا اور ساتھ ہی میں یورپی زبانوں سے کتابوں کے تراجم کروائے گئے۔ مولوی عبدالحق نے انجمن ترقی اردو کے تحت یورپ کے کلاسیکل ادب کا ترجمہ کروایا مگر محض یہ تراجم اردو زبان کو اس لئے علمی زبان نہیں بنا سکے کیونکہ اس میں بنیادی طور پر تحقیقی اور علمی کام نہیں ہوا۔

جب برطانوی دور میں حکومت کے تعلیمی اداروں میں انگریزی کو ذریعہ تعلیم بنایا گیا تو اس نے تعلیم یافتہ طبقوں کے لئے یورپی علوم کے دروازے کھول دیئے۔ علم کا یہ پیش بہا خزانہ نہ صرف انگریزی زبان میں تھا بلکہ اس کے زبان میں دوسری یورپین زبانوں کے ادب اور علوم تک بھی ان کی رسائی ہوگئی۔ اس نے اردو اور دوسری ہندوستانی زبانوں کی اہمیت کو کم کر دیا۔ اب ہندوستانی تعلیم یافتہ طبقے نے انگریزی زبان کو اختیار کر کے اس کو اپنے خیالات کے اظہار کا ذریعہ بنا دیا۔

اردوزبان اس کا مقابلہ نہیں کرسکی اوراس نے خودکوشعروشاعری اور مذہب تک محدود کرلیا۔

پاکستان کی تحریک کے وقت اردوزبان کو بھی بطور علامت استعمال کیا گیا۔لہٰذا پاکستان بننے کے بعد اگر چہ اس کوقومی زبان کا درجہ تو دیدیا گیا مگراس کی ترقی اوراس کوایک علمی زبان بنانے کی کوشش نہیں کی گئی، کراچی یونیورسٹی اور مقتدرہ قومی زبان نے سائنسی اور سماجی علوم کی اصطلاحات شائع کیں۔لیکن جب تک ان کا استعمال نہ ہو۔اس وقت تک یہ اصطلاحات نافہم رہتی ہیں۔ کیونکہ جب کسی معاشرے میں کوئی نئی سائنس اورٹیکنالوجی کی ایجاد ہوتی ہے تواس کے ساتھ ہی اس کے ایک ایک پرزے کا نام بھی وجود میں آتا ہے۔اس کی مثال کمپیوٹر ہے۔امریکہ اور یورپ جہاں یہ ایجاد ہوا، وہاں اس کے چھوٹے سے چھوٹے پرزے کوایک نام دیا۔دوسرے اس ایجاد کے ساتھ ان کی ذہنی ترقی ہوئی۔جب ہم کمپیوٹر کا استعمال کرتے ہیں تو یہ ہمارے لئے ایک اجنبی ایجاد ہے جس کی تخلیق میں ہمارا کوئی حصہ نہیں۔اس لئے اس کے کل پرزوں کے نام وہی رکھنے پڑتے ہیں جو کہ انگریزی میں ہیں۔

ہمارے دوست محمود مرزا صاحب کا کہنا ہے کہ اگر آج سے ساٹھ، ستر سال پہلے اس بات کی کوشش کی جاتی کہ اردو میں سائنس، ٹیکنالوجی اور سماجی علوم کے تراجم کئے جائیں تو اس وقت یہ ممکن تھا کہ ان کے ذریعہ اردو ایک علمی زبان بن سکتی تھی لیکن اب ایسا ممکن نہیں ہے کیونکہ موجودہ دور میں اس قدر تیزی سے علم تخلیق ہورہا ہے اور ہر موضوع کے اوپر ہر دن کئی سو کتابیں شائع ہوتی ہیں کہ ان کا ترجمہ کرنا اب تقریباً ناممکن ہوگیا ہے۔لہٰذا اردوزبان کو جو علمی زبان بننے کا موقع تھا وہ کھویا جاچکا ہے۔

نوکرشاہی

ریاست کے وجود میں آنے کے بعداس کے انتظام کے لئے ضروری تھا کہ عہدہ داروں کا تقرر ہو جو ملک میں امن و امان برقرار رکھیں، سلطنت کی آمدنی اور اخراجات کا حساب رکھیں۔ جرائم کی روک تھام کریں۔لوگوں کے ساتھ عدل وانصاف کریں، قانون کا نفاذ کریں۔حکمراں اور حکومت کی حفاظت کریں۔اس مقصد کے لئے جن عہدہ داروں کا انتخاب ہوتا تھا ان کا انتخاب امراء کے طبقے سے کیا جاتا تھا۔لہٰذا نوکرشاہی کے ادارے کا تعلق اعلیٰ ذات کے طبقوں سے ہوتا تھا جبکہ عوام کی پہنچ حکومت کے اعلیٰ عہدوں تک مشکل سے ہوتی تھی۔اس کا نتیجہ یہ تھا کہ عہدہ داروں کا تقرران کی لیاقت اور ذہانت سے زیادہ ان کے خاندان سے ہوتا تھا۔

اس ادارے میں انقلابی تبدیلی قدیم چین میں ہوئی، جہاں حکومت کے عہدہ داروں کے لئے ذہانت، لیاقت ضروری تھی اس مقصد کے لئے ان کے ہاں مقابلے کے امتحان ہوتے تھے جس میں پورے ملک سے ہر طبقے کے لوگ حصہ لیا کرتے تھے۔اس نظام کی ابتداء ''ہان'' خاندان کے بادشاہ چاؤ سو (206-195 ق۔م) نے کی۔اگرچہ وہ خود پڑھا لکھا نہیں تھا مگر اس کو یہ احساس تھا کہ حکومت کے انتظام کے لئے سفارشی یا امراء کے خاندان کی ضرورت نہیں بلکہ ایسے نوجوانوں کی ضرورت ہے جن کا تعلق چاہے کسی طبقے سے ہو، مگر وہ ذہین اور باصلاحیت ہوں۔اس مقصد کے لئے ریاست کی جانب سے مقابلے کے امتحانات ہوا کرتے تھے۔مقابلے کے امتحان میں حصہ لینے والوں کے لئے ضروری تھا کہ وہ چین کی قدیم تاریخ، کنفیوشس کی تعلیمات، ادب اور اخلاقیات پر مکمل عبور حاصل کریں۔اولین امتحانات چین کے مختلف علاقوں میں ہوتے تھے۔ اس میں جو کامیاب ہو جاتے تھے وہ دارالسلطنت میں فائنل امتحان کے لئے آتے تھے۔امتحان میں سخت پابندی کی جاتی تھی اور نقل کی سخت سزائیں تھیں، ایک بار امتحان کے نگران کا اس لئے

سرقلم کروا دیا گیا کہ وہ نقل کی روک تھام نہیں کر سکا۔ جو امیدوار امتحان پاس کر لیتے تھے تو انہیں حکومت کے اعلیٰ عہدوں پر تعین کیا جاتا تھا۔ ان کی شادی شاہی خاندان کی شہزادیوں سے کر دی جاتی تھی تا کہ وہ حکمراں طبقے کا حصہ بن کر حکومت سے اور زیادہ وفادار ہو جائیں۔ سماج میں ان کی حیثیت کو ممتاز رکھنے کے لئے ان کا مخصوص لباس ہوتا تھا جو ان کے مرتبے اور عہدے کو ظاہر کرتا تھا۔ ان کی سواری کے لئے خاص قسم کی گاڑیاں ہوتی تھیں۔ نوکر شاہی کا یہ نظام دو ہزار سال تک ریاست کے انتظامات کرتا رہا۔ چین کے یہ عہدہ دار مینڈارن (Mandarin) کہلاتے تھے۔

جدید عہد میں نوکر شاہی کے ادارے کو جرمنی کی ریاست پروشیا (Prussia) میں اٹھارہویں صدی میں نئے انداز میں منظّم کیا گیا۔ اس کو مختلف شاخوں میں تقسیم کر کے اس کے قوانین وضوابط مرتب کئے گئے، جن سے یورپ کی دوسری ریاستیں متاثر ہوئیں۔

ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے حکومت کے عہدہ داروں کے لئے انڈین سول سروس قائم کی جس کے امتحانات لندن میں ہوتے تھے۔ امیدوار کی عمر بیس سال ہوتی تھی۔ امیدوار کے لئے لازمی تھا کہ وہ لاطینی اور انگریزی زبانوں کے ساتھ ساتھ سماجی علوم کا گہرائی سے مطالعہ کرے۔ ملازمت کی مدت تیس سال ہوتی تھی۔ پچاس سال کی عمر میں اسے ریٹائر کر دیا جاتا تھا۔ تا کہ ہندوستانی کسی بوڑھے انگریز عہدہ دار کو نہ دیکھ پائیں، ان افسروں کی تنخواہیں اور مراعات بہت زیادہ تھیں تا کہ وہ کسی بدعنوانی میں ملوث نہ ہوں۔ ہندوستان میں آنے کے بعد انہیں یہاں کی مقامی زبانیں بھی سیکھنی پڑتی تھیں۔ ان عہدہ داروں نے ہندوستان میں برطانوی حکومت کو مستحکم کیا۔

ابتدائی دور میں کسی ہندوستانی کے لئے یہ امتحان پاس کر کے نوکر شاہی میں آنا بہت مشکل تھا۔ مگر ان پابندیوں کے باوجود ''رابندر ناتھ ٹیگور'' کے بھائی نے لندن جا کر امتحان میں شرکت کی اور کامیاب ہو گئے۔ اس پر برطانوی حکومت اس قدر پریشان ہوئی کہ اس نے 20 سال کی عمر گھٹا کر 18 سال کر دی تا کہ کوئی ہندوستانی امتحان میں کامیابی حاصل نہ کر سکے۔

لیکن جیسے جیسے ہندوستان میں سیاسی شعور آیا۔ یہ مطالبہ کیا گیا کہ مقابلے کے امتحان ہندوستان میں بھی ہونے چاہئیں۔ اس کی وجہ سے آہستہ آہستہ برطانوی نوکر شاہی میں ہندوستانیوں کی تعداد بھی بڑھنے لگی۔

برصغیر کی آزادی کے بعد پاکستان کو یہ ادارہ وراثت میں ملا۔ مقابلہ، ابتدائی دور میں مقابلے کے امتحانات معیاری ہوتے تھے۔مگر وقت کے ساتھ ساتھ دوسرے اداروں کی طرح اس میں بھی زوال آیا۔خاص طور سے جب اس میں بلا مقابلہ لوگوں کی نام زدگی ہونے لگی پروموشن اور عہدوں کے انتخاب میں سفارش کا عمل دخل ہو گیا۔اس کی وجہ سے اس ادارے میں ان افسران کا عمل دخل بڑھ گیا جو خوشامد، سازش اور بدعنوانی میں مہارت رکھتے ہیں۔

نوکر شاہی کے ادارے کی تاریخ یہ بتاتی ہے کہ اگر اس میں سفارشی یا پسندیدہ لوگوں کا اعلیٰ عہدوں پر تقرر کیا جائے تو وہ ریاست کے نظم و ضبط کو تباہ کر دیتے ہیں۔اس لئے ریاست کے انتظامات کے لئے دیانت دار، ایمان دار اور ذہین افسروں کی ضرورت ہوتی ہے۔قدیم چین کی ریاست نے عہدہ داروں کے انتخاب کے لئے جس معیار کو مقرر کیا تھا، پاکستان کو آج اُس تاریخ سے سبق سیکھنے کی ضرورت ہے کیونکہ پاکستان کی نوکر شاہی اپنی مراعات اور سہولتوں کے باوجود اس لئے ناکام ہے کہ اس میں عہدہ داروں کی تقرری ذہانت اور لیاقت سے زیادہ سفارش پر ہوتی ہے۔ اس لئے یہ ادارہ پاکستان کی ترقی میں رکاوٹ بنا ہوا ہے۔خاص طور سے 1970ء کے بعد جب یہ فوجی آمروں اور سیاست دانوں کے مفادات کو پورا کرنے کا آلہ کار بن گیا اور اپنی آزادی اور خود مختاری کو کھو دیا۔

موجودہ دور میں پاکستان کی نوکر شاہی اپنی عزت و وقار کھو چکی ہے اور معاشرے کے لئے ایک بوجھ بن گئی ہے۔

جرم اور سزا

پاکستان میں اکثر لوگوں کا یہ مطالبہ سامنے آیا ہے کہ مجرموں کو سرِ عام پھانسی پر لٹکایا جائے یا انہیں کوڑے مارے جائیں، اور سخت سزائیں دی جائیں۔ اس مطالبہ کے پس منظر میں جو ذہن کام کر رہا ہے وہ یہ ہے کہ سخت سزاؤں کے ذریعہ جرائم کی روک تھام ہو سکتی ہے، اور یہ کوئی نئی بات بھی نہیں ہے، ماضی میں اس پر عمل ہوتا رہا ہے، مجرموں کو چوراہوں پر پھانسی دی جاتی رہی ہے ان کے جسم کے اعضاء کاٹے جاتے رہے ہیں، اور بطور عبرت ان کو اذیت دی جاتی رہی ہے مگر اس کے باوجود جرائم ختم نہیں ہوئے تھے۔

قدیم یونان میں ڈریکو (Draco) نامی ایک شخص نے جرائم کے لئے سخت قوانین بنائے، مگر پھر بھی یہ جاری رہے، حمورابی کے قوانین میں بھی مجرموں کے لئے سخت سزائیں تجویز کی گئی تھیں، لیکن یہ قوانین ان جرائم کے خاتمہ میں ناکام رہے۔

ان قوانین کے پس منظر میں حکمران طبقوں کی نجی جائیداد، دولت، اور ان کی مراعات کا تحفظ تھا۔ جس کی وجہ سے معاشرے کی اکثریت محروم اور مفلسی کا شکار ہو جاتی تھی، اس لئے ان قوانین کا مقصد تھا کہ لوگوں کو چوری، ڈاکہ زنی، اور لوٹ مار سے روکا جائے اس لئے ایک جانب تو ایسے قوانین بنائے گئے، تو دوسری جانب ان میں اخلاقی قدروں کے ذریعہ انہیں ذہنی طور پر اس پر تیار کیا کہ وہ ایماندار اور دیانت دار ہوں، اور مالک و آقا کے مال و اسباب کو تحفظ دیں۔

ایک امریکی غلام ہنری بب (Henry Bib) نے اپنی یادداشتیں لکھی ہیں۔ اس میں، اس نے لکھا ہے کہ مالک نے اس پر الزام لگایا کہ وہ اس کے اسٹور سے اناج کے تھیلے چوری کرتا تھا۔ اس پر بب نے لکھا کہ اس نے یہ چوری کی تھی، مگر یہ چوری اس لئے نہیں تھی کیونکہ اس نے کھیتوں میں کام کر کے، محنت و مزدوری کے بعد یہ اناج پیدا کیا تھا، چونکہ وہ ایک غلام تھا، اس لئے اسے اس

محنت کا کوئی معاوضہ نہیں دیا گیا، اسے کھانے کے لئے صرف اس قدر دیا جاتا تھا کہ جس پر گزارہ مشکل سے ہو۔ اس وجہ سے فاقہ زدہ رہنے کی صورت میں اس نے مالک کے اسٹور سے اپنا حق لیا، یہ چوری نہیں تھی۔ لیکن غلاموں کے معاشرے میں جبر وظلم سے محنت کرانا، اور پھر اس کو مشکل سے کھانے کے لئے دینا، قانونی طور پر جائز تھا۔ ایسے قانون کی خلاف ورزی کو جرم تصور کیا جاتا تھا مگر جب انسان بھوکا ہو، تو وہ سزا کے ڈر اور خوف کے باوجود یہ جرم کرتا ہے۔ فرانس کے مشہور ناول نگار وکٹر ہیوگو کے ناول ''لے میزرابل'' (Le Miserable) کی کہانی یہی ہے کہ ایک بھوکا شخص روٹی چوری کر لیتا ہے، اور اس جرم میں انسپکٹر جو قانون کا حامی ہے، اس کے پیچھے ہے تاکہ اس کو سزا دلوائے۔ کیا ان کا انجام یہ ہے کہ بالآخر انسپکٹر کو احساس ہوتا ہے کہ وہ ایک غلط قانون کے نفاذ میں سرگرداں ہے اور آخر میں وہ مایوس ہو کر خودکشی کر لیتا ہے۔ جرمن فلسفی کانٹ کا کہنا تھا کہ اگر اس کا ملازم خدا سے ڈرتا ہے تو یہ اچھی بات ہے، کیونکہ اس وجہ سے وہ چوری نہیں کرے گا۔

عہد وسطیٰ کے انگلستان میں معمولی جرائم کی سخت سزائیں تھیں۔ عام لوگوں کو یہ حق نہیں تھا کہ وہ جنگل میں شکار کریں، شکار کرنا امراء کے لئے مخصوص تھا۔ چوری اور ڈاکہ زنی کو قابل نفریں جرموں میں شمار کیا جاتا تھا، عام لوگوں کو یہ حق بھی نہیں تھا کہ وہ ہتھیار رکھیں لیکن ان سخت سزاؤں کے باوجود لوگ جرم کرتے تھے۔ تیرہویں صدی میں کسانوں کی ایک تحریک چلی تھی جو ''بلیک فیس'' یا کالے حبشیوں کی تحریک تھی، اس میں کسانوں کے جتھے رات کو منہ پر کالک کر کے جنگلوں میں جاتے تھے اور شکار کرتے تھے۔ مگر شکار شدہ جانور وہیں چھوڑ دیتے تھے۔ یہ ایک طرح کا احتجاج تھا کہ قانون ان کے حق کو روک رہا ہے۔

اس وجہ سے آہستہ آہستہ یہ شعور آیا کہ جرائم کا خاتمہ سخت سزاؤں کے ذریعہ نہیں ہوگا، بلکہ اس کے پس منظر میں ان عوامل اور وجوہات کو ڈھونڈنا ہوگا کہ جن کی وجہ سے یہ جرائم ہوتے ہیں۔ یہ وجوہات معاشی، سماجی اور نفسیاتی تھیں، جن پر اسکالرز اور سیاستدانوں نے غور کیا اور جرائم کی روک تھام کے لئے نئے طریقوں اور قوانین کو نافذ کیا۔

پاکستان میں جرائم کی وجہ معاشی ناہمواری ہے، دولت مند اور عوام کے درمیان بہت فرق پیدا ہو گیا ہے۔ ریاست اور اس کے ادارے حکمران طبقوں کے مفادات کا تحفظ کر رہے ہیں، جب کہ عوام کو ریاست نے بے سہارا چھوڑ دیا ہے۔ اگرچہ ایک فرد ایمانداری کی زندگی گزارنا چاہتا

ہے۔لیکن ایمانداری کی ایک حد ہے۔ جب آمدنی سے زیادہ اخراجات ہو جائیں تو اس کمی کو پورا کرنے کے لئے، اگر مواقع ہوں تو وہ رشوت میں ملوث ہو جاتا ہے، اور اس ذریعہ سے اپنے اخراجات پورے کرتا ہے۔ یہ نچلے درجہ کے لوگ ہیں جو ایمانداری کی سرحدوں کو توڑ کر مجبوراً رشوت لینے پر مجبور ہوتے ہیں، ان سے نیچے کے لوگ جن میں چپراسی، چوکیدار اور عدالت کے محرر ہیں عاجزانہ طور پر لوگوں سے ٹپ وصول کر کے اپنے اخراجات پورے کرتے ہیں، اور اپنی عزت نفس اور خودداری کو ختم کر کے بھک منگوں کی صف میں شامل ہو جاتے ہیں۔

اب وہ نوجوان رہ جاتے ہیں کہ جن کے پاس نہ تو رشوت لینے کے مواقع ہیں اور نہ ہی وہ ٹپ لے کر اپنا گزارا کر سکتے ہیں، لہٰذا بیروزگاری اور محرومی کی اس حالت میں وہ جرائم کا رخ کرتے ہیں، اگر چہ اس میں خطرات ہوتے ہیں، قتل ہوئے، گرفتاری اور اذیت کا سامنا، مگر وہ ان سب خطرات کو قبول کرتے ہوئے چھوٹے جرائم سے لے کر ڈاکہ زنی تک کرتے ہیں، اس میں وہ مارے بھی جاتے ہیں، اور قید و بند سے بھی دوچار ہوتے ہیں، پولیس مقابلوں میں ان کے قتل بھی ہوتے ہیں، مگر ان تمام باتوں کے باوجود جرائم کا سلسلہ اسی طرح سے جاری ہے۔

ہماری ریاست اور حکمران طبقے جرائم کی اصل وجوہات کو جاننے کے بجائے، اس پر زور دیتے ہیں کہ سخت سزاؤں کے ذریعہ ان کا خاتمہ کیا جائے۔اس کے نتیجہ میں یہ سلسلہ کچھ عرصہ کے لئے رک جاتا ہے مگر ختم نہیں ہوتا ہے۔ ماحول عادی مجرم اور بدمعاس پیدا کر دیتا ہے جن کا پیشہ ہی چوری، ڈاکہ اور قتل ہو جاتا ہے۔

موجودہ دور میں جرائم کا مطالعہ کرنے کے بعد، اس نتیجہ پر پہنچے ہیں کہ جب تک سماج کی معاشی، سماجی اور نفسیاتی وجوہات کو ختم نہیں کیا جائے گا، اس وقت تک جرائم کا خاتمہ محض سزاؤں سے ممکن نہیں ہوگا۔ اس سلسلہ میں ریاست اور اس کے اداروں کا رویہ بدلنا ہوگا جو اب تک محض حکمراں طبقوں کے مفادات کو تحفظ دیتے ہیں، اور عام لوگوں کو نظر انداز کرتے ہیں، اس لئے جاگیردارانہ اور قبائلی جمہوریت کی جگہ جب عوامی جمہوریت آئے گی تو اس وقت ریاست عام لوگوں کی فلاح و بہبود کا خیال کرے گی اور ان کی بنیادی ضرورتوں کو پورا کرے گی۔ یہ تبدیلی جرائم کو ختم کرنے کی ابتداء ہوگی۔ عام لوگ پُرسکون اور آسودہ زندگی گزارنا چاہتے ہیں، وہ جرائم سے دور خوشگوار ماحول میں رہنا چاہتے ہیں۔ اس لئے سوال ہے کہ کیا ہماری ریاست اور حکمران طبقے ان کی اس خواہش کو پورا کریں گے؟

دوکانداراورتاجر

ہمارے معاشرے میں یہ شکایت عام ہے کہ دوکانداراورتاجرلوگوں کے ساتھ دھوکہ کرتے ہیں،اشیاء میں ملاوٹیں کرتے ہیں،جعلی دوائیں،شربت،مسالے،اورکھانے بنانے میں اپنی تمام ذہانت اورمحنت صرف کردیتے ہیں،کم تولتے ہیں،کم ناپتے ہیں،ایک ہی بازار میں ہردوکانداراپنی مرضی کےنرخ مقررکرتا ہے۔منافع کالالچ اس قدرغالب ہے کہ اس میں نہ تو اخلاقی قدروں کا خیال ہے،اورنہ ہی مذہبی وعظ اورنصیحتیں کارگرہیں۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ جوکچھ آج یہ حضرات کررہے ہیں، یہ کوئی نئی بات نہیں ہے۔ برصغیر کی تاریخ میں ان کا یہی کردارنظرآتا ہے۔ضیاءالدین برنی، جوعہد تغلق کا مورخ تھا،اس نے اپنی کتاب ''تاریخ فیروزشاہی''میں ان کے بارے میں لکھا ہے کہ:

> ''بازار کےلوگ نہایت بےشرم، بےباک،مکار،قانون شکن،دیوانے، جھوٹے،اورفریبی تھے۔چونکہ اپنے سامان پران کومکمل اختیار ہوتا تھا،وہ خرچ کاتعین بھی خودکرتے تھے۔اس معاملہ میں بادشاہ عاجزرہے ہیں، اوراس مکارقوم کے لئے خریدوفروخت کےقوانین بنانے میں وزراءنے ہمیشہ ناکامی کامنہ دیکھا ہے۔''

سلطان علاءالدین خلجی نے جب معاشی اصلاحات کا اعلان کیا تواس نے ہرچیز کی قیمت بھی مقررکردی،اورسختی کےساتھ اس پرعمل کیا کہ دوکاندارگاہکوں کودھوکہ نہ دیں،اورمقررہ نرخ پر اشیاءفروخت کریں،مگر جب اسے معلوم ہوا کہ اس کےقوانین کی پابندی نہیں ہورہی تو، ضیاء الدین برنی کےمطابق:

> ''سلطان علاءالدین نےغورکیااوردیکھا کہ بازار کےلوگ اس قدرٹھیک

نہیں ہوئے جتنا کہ ان کو ہونا چاہئے تھا۔ وہ بیوقوفوں اور بچوں کو دھوکہ
دینے سے باز نہیں آتے۔ چنانچہ وہ یہ کرتا کہ غلاموں کے کم عمر اور نادان
بچوں کو جو سلطان کے کبوتر خانوں میں کام کرتے تھے، اپنے پاس طلب
کرتا، دس دس بیس بیس درہم ان کے ہاتھ میں دیتا اور ان کو حکم دیتا کہ وہ
بازار میں جائیں۔ ان غلاموں کے لڑکوں میں سے کوئی نان اور بھنے
ہوئے چنے اور کوئی نان اور مکئی خرید کر لائے۔ کوئی حلوہ، کوئی ریوڑی، کوئی
خربوزہ اور کوئی ککڑی خریدے، اور سلطان کے سامنے لائے۔ جب وہ
غلام لڑکے ہر قسم کی اشیاء خرید کر سلطان کے سامنے لاتے تو اس وقت
رئیس (منڈی کا انچارج) کو بھی طلب کیا جاتا۔ رئیس کی موجودگی میں
بچوں کی لائی ہوئی یہ اشیاء تولی جاتیں، سرکاری نرخ کے حساب سے جن
چیزوں کا وزن کم ہوتا، اس دوکاندار کو دکان سے نیچے اتروایا جاتا اور جس
قدر وزن کم ہوتا، اتنا ہی گوشت اس کے جسم سے کاٹ لیا جاتا۔ اس سزا
کے متواتر دیئے جانے سے بازار کے لوگ بالکل درست ہو گئے۔''

ضیاء الدین برنی کے اس بیان سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہمارا معاشرہ آج بھی اس صورت حال سے دوچار ہے کہ جو عہد وسطیٰ میں تھی۔ صنعت کار، سرمایہ دار، دوکاندار اور تاجر منافع کا لالچ میں قانون، اخلاق، اور مذہب کی خلاف ورزی کرتے ہیں اور ہر طریقہ سے دولت اکٹھی کرنے کے خواہش مند ہیں، چاہے اس کے نتیجہ میں لوگوں کی صحت خراب ہو، وہ بیماریوں میں مبتلا ہوں، بھوک اور مفلسی کا شکار ہی کیوں نہ ہوں۔

پاکستان میں جعلی اشیاء کی تیاری اور خرید و فروخت کھلے عام ہوتی ہے اس کے لئے اگرچہ قوانین موجود ہیں، اور ان کو نافذ کرنے والے ادارے بھی ہیں، مگر رشوت اور بدعنوانی کے سبب ان پر عمل نہیں ہوتا ہے۔ ایک طرف تاجر منافع کماتے ہیں، تو دوسری جانب اداروں کے لوگ دولت اکٹھی کر کے زندگی کی سہولیات حاصل کرنا چاہتے ہیں۔

اس کی ایک اہم وجہ تو یہ ہے کہ لوگوں میں معاشی طور پر عدم تحفظ کا احساس ہے۔ ریاست نے تعلیم اور صحت کو نجی ہاتھوں میں دے کر اپنی ذمہ داری سے علیحدگی اختیار کر لی ہے۔ اب

معاشرے میں دولت ہی وہ ذریعہ ہے کہ جس کے تحت بنیادی ضرورتوں کا حصول ممکن ہے۔ مہنگائی اور بیروزگاری کی وجہ سے ہر فرد کی یہ خواہش ہے کہ اس کے پاس اس قدر دولت ہو کہ وہ اپنے خاندان کی زندگی بہتر طریقہ سے ممکن بنا سکے۔ اس لئے نچلی سطح پر رشوت اور بدعنوانی کی وجہ یہ عدم تحفظ ہے، اور ادارے کے لوگ اس وجہ سے تاجروں اور صنعت کاروں کو موقع دیتے ہیں کہ وہ زیادہ سے زیادہ منافع کمائیں اور اس میں سے ایک حصہ انہیں دیدیں۔ اس سلسلہ میں قانون کا نفاذ اس وقت ممکن ہوسکتا ہے کہ جب معاشرہ میں ریاست لوگوں کو معاشی تحفظ فراہم کرے، اور یہ ممکن بنائے کہ جعل سازی اور نرخ سے زیادہ قیمت وصول کرنے کی صورت میں جرم کا ارتکاب کرنے والا سزا کا مستحق ہوگا۔ یہ طریقہ کار یورپ کے ترقی یافتہ ملکوں میں ہے، اس لئے وہاں مقرر نرخ سے زیادہ قیمت وصول کرنا جرم ہے، چونکہ وہاں قانون کا اطلاق سب پر یکساں ہوتا ہے، اور کوئی اس سے مبرا نہیں ہوتا، اس لئے اس پر عمل ہوتا ہے۔

قانون کے ساتھ ہی صنعت کاروں اور دکانداروں میں اس احساس کو پیدا کرنا بھی ضروری ہے کہ وہ بھی اس معاشرے کا ایک حصہ ہیں اور معاشرے کی صحت، توانائی اور اخلاقی تربیت میں ان کا بھی حصہ ہے۔ معاشرے کے ایک فرد ہونے کی حیثیت سے ان کی ذمہ داری ہے کہ وہ اس کو مستحکم رکھیں۔ اگر معاشرہ تباہ ہوگا تو اس کے ساتھ وہ بھی اس تباہی کا حصہ ہوں گے۔

تاریخ سے بہت کچھ سیکھا جاسکتا ہے۔ علاء الدین خلجی نے اپنے دورِ حکومت میں بازار کے قوانین پر سختی سے عمل کرایا۔ اس لئے عام لوگ اس سے بہت خوش تھے اور اس کے عہد کو آنے والی نسلیں بھی یاد کرتی تھیں۔ مگر بادشاہت میں اختیارات فردِ واحد کے ہاتھ میں ہوتے ہیں۔ اس لئے اس کے قوانین اس کے ساتھ رخصت ہوگئے۔ اس جمہوری دور میں یہ اختیارات اداروں کے پاس ہیں، اس لئے اگر ادارے مضبوط ہوں، اور بدعنوانی سے پاک ہوں، تو قوانین اور ضوابط کو ہمیشہ کے لئے نافذ کیا جاسکتا ہے اور ان پر عمل بھی کرایا جاسکتا ہے۔ اس لئے سوال ہے کہ کیا ہم ان اداروں کو مستحکم کرنے کے خواہش مند ہیں یا نہیں؟

کیا پاکستان میں انقلاب آ سکتا ہے؟

پاکستان کی موجودہ صورت حال کو دیکھتے ہوئے اکثر لوگ اب اس خیال کا اظہار کرتے ہیں کہ اس صورت حال کو صرف انقلاب کے ذریعہ ہی درست کیا جا سکتا ہے۔ تاریخ کے مطالعہ سے یہ بات زیادہ واضح ہو کر سامنے آتی ہے کہ جب ریاست اور اس کے ادارے فرسودہ ہو جائیں، ان میں ٹوٹ پھوٹ ہو جائے، تو ایک صورت تو یہ ہوتی ہے کہ انہیں اصلاحات کے ذریعہ ٹھیک کیا جاتا ہے اور ان میں جو خرابیاں پیدا ہو جاتی ہیں، انہیں نئے حالات کے تحت تبدیل کیا جاتا ہے، مگر جب حکمراں طبقے یا مراعات یافتہ لوگ اصلاحات کے دروازے بند کر دیتے ہیں اور اداروں کی اصلاح کے لئے تیار نہیں ہوتے ہیں، تو اس صورت میں ریاست شکستہ اور خستہ ہو کر ٹوٹ جاتی ہے۔ اس بحران سے فائدہ اٹھا کر غیر قانونی سرگرمیاں بڑھ جاتی ہیں، اور لوگوں کی جان و مال کا تحفظ کرنے والا کوئی نہیں رہتا ہے، لہٰذا ان حالات میں جب انقلاب آتا ہے تو وہ قدیم روایات و اداروں اور طبقوں کی مراعات کو ختم کر کے ایک نئے نظام کی بنیاد ڈالتا ہے، ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے، اور ایک نئی زندگی کا وجود عمل میں آتا ہے۔

مگر کسی بھی سوسائٹی کا بحران انقلاب لے کر نہیں آتا ہے۔ کیونکہ انقلاب کے لئے شرائط ہوتی ہیں، اس کو لانے کے لئے ذہنی تیاری کی ضرورت ہوتی ہے کیونکہ انقلاب کا مطلب یہ نہیں ہے کہ پرانے نظام کو بدل دیا جائے۔ بلکہ سب سے اہم مرحلہ یہ ہوتا ہے کہ اس کی جگہ ایک متبادل نظام لایا جائے۔ اس متبادل نظام کو لانے کے لئے ایک گروہ، جماعت اور لوگوں کی ضرورت ہوتی ہے کہ جو تخلیقی ذہن رکھتے ہوں، اور جو قدیم اداروں اور روایات کی جگہ نئی روایات اور اداروں کی تعمیر اور تشکیل کے لئے خیالات و نظریات کے حامل ہوں۔ کیونکہ انقلاب کا سب سے مشکل مرحلہ ہوتا ہے کہ سوسائٹی کو کن بنیادوں پر استوار کیا جائے، جو قدیم نظام سے جدا ہوں اور نئے حالات

سے مطابقت رکھتے ہوں، اس مرحلہ پر دانشوروں، مفکروں، سیاستدانوں اور سماجی کارکنوں کی ضرورت ہوتی ہے جو ذہنی طور پر پختہ ہوں، اور نئے نظام کی تشکیل کی اہلیت رکھتے ہوں۔

تاریخ میں انقلاب کی کئی قسمیں ہیں۔ مورخ خاص طور سے ان اہم واقعات کو، کہ جن کے باعث معاشرے میں یا ریاست کے ادارے میں بنیادی تبدیلیاں آئیں، ان کو انقلاب سے تشبیہ دیتے ہیں۔ لہٰذا کچھ انقلابات ایسے ہیں کہ جو تبدیلیاں لے کر آئے، مگر اس تبدیلی کے نتیجہ میں کوئی خوں ریزی نہیں ہوئی، لیکن کچھ انقلابات ایسے ہیں کہ جو خوں ریزی اور تشدد کے بعد تبدیلی کے عمل کو لے کر آئے، مثلاً مورخ 1688ء کے اہم سیاسی واقعات کو ''شاندار انقلاب'' کے نام سے تعبیر کرتے ہیں کیونکہ اس انقلاب نے جو کہ اوپر کی سطح سے آیا تھا، اور جس کے انگلستان کی سیاست پر اہم اثرات ہوئے تھے، اس لئے شاندار انقلاب کہتے ہیں، کیونکہ اس میں انگلستان کی پارلیمنٹ نے جیمس دوم کو، اس کے کیتھولک عقیدہ کی وجہ سے تخت و تاج سے محروم کر دیا، اور اس کی جگہ ہالینڈ کے ولیم اور میری کو اپنا حکمران بنایا۔ اس سے پارلیمنٹ کے اختیارات کا پتہ چلتا ہے کہ جو اس قدر طاقت ور ہو چکی تھی کہ وہ کسی بادشاہ کو ہٹا کر اس کی جگہ نئے حکمران کے انتخاب کا اختیار حاصل کر چکی تھی۔ اس مرحلہ پر اس سوال کا جواب بھی ملا کہ انگلستان پر کس کی حکومت ہے؟ بادشاہ یا پارلیمنٹ کی؟

جواب یہ تھا کہ اب دونوں برابر کے اختیارات رکھتے ہیں۔ اس موقع پر پارلیمنٹ نے بادشاہ کو مجبور کیا کہ وہ بل آف رائٹس پر دستخط کرے جس کے تحت اس نے اپنے بہت سے اختیارات چھوڑ دیئے، اس مرحلہ سے انگلستان میں پارلیمنٹ کے اختیارات بڑھتے چلے گئے اور بادشاہ سیاسی طور پر کمزور ہوتا چلا گیا۔ اگرچہ یہ انقلاب اوپر کے طبقوں میں آیا تھا، مگر اس نے پارلیمنٹ کو طاقت ور بنا کر سیاسی اداروں میں اصلاحات کی راہیں ہموار کر دیں۔ مزید یہ کہ یہ انقلاب بغیر کسی خوں ریزی کے آیا۔

دوسرا اہم انقلاب امریکہ کا ہے جب اس نے انگلستان سے آزادی حاصل کی تو اسے ایک نئے نظام کی ضرورت تھی کہ جو کولونیل ازم کے نظام سے مختلف ہو۔ لہٰذا امریکی سیاستدانوں، دانشوروں، اور سماجی راہنماؤں نے آپس کی بحث و مباحثہ کے بعد ایک ایسے نظام کی تشکیل کی کہ جو جمہوری اور سیکولر ہو، اور جس میں عوام کو ان کے بنیادی حقوق کی ضمانت ہو۔ نئے امریکی دستور

میں اس نظام کا خاکہ تیار کیا گیا، اس انقلاب نے، جو کہ نوآبادیات کے خاف جنگ میں کامیابی کے بعد عمل میں آیا، اس نے امریکی معاشرے کی جمہوری روایات اور اداروں کی بنیاد ڈالی۔

تیسرا اہم انقلاب فرانس کا تھا، اس انقلاب کی وجہ یہ تھی کہ جب ریاست کے ادارے اپنی افادیت کھو چکے تھے، اور ان کی اصلاح نہ کی جا سکی، تو اس صورت میں وہ طبقے کہ جو سیاست میں اپنا حصہ چاہتے تھے، انہوں نے انقلاب کے راستے کو اختیار کیا۔ انقلاب کے پہلے مرحلے میں اداروں میں اصلاحات روشناس کرائی گئیں، دوسرے مرحلہ میں انقلاب پُرتشدد ہوا، اور انقلاب کے راہنماؤں نے اس کی کامیابی کی خاطر تقریباً چالیس ہزار لوگوں کے سر قلم کئے جن میں بادشاہ اور ملکہ بھی شامل تھیں۔

چوتھا انقلاب روس کا ہے، جو پہلی جنگ عظیم کے دوران وقوع پذیر ہوا جب کہ روس جنگ میں ناکام ہو رہا تھا، اور روسی عوام معاشی اور سیاسی بحران کا شکار تھے، اس انقلاب نے بھی تشدد کے راستے کو اختیار کیا، اور وہ تمام طبقے اور جماعتیں جو اس کی راہ میں رکاوٹ تھیں، انہیں قتل و خوں ریزی کے ذریعہ راستہ سے ہٹا دیا۔ اس میں زار روس اور اس کا پورا خاندان شامل تھا۔

پانچواں انقلاب چین کا تھا، جو دوسری جنگ عظیم کے بعد، اور جاپان کے حملوں کے نتیجہ میں عمل میں آیا۔ اس انقلاب نے بھی تشدد کا راستہ اختیار کرتے ہوئے، انقلاب دشمنوں کا صفایا کیا۔

ان انقلابات کی تاریخ سے ایک بات واضح ہو کر، تو یہ آئی ہے کہ یہ اچانک نہیں آئے، بلکہ ان انقلابوں کے پس منظر میں نظریات و افکار کا اہم حصہ تھا، جنہوں نے انقلاب کے راہنماؤں کو ذہنی پختگی دی۔

انگلستان کے شاندار انقلاب کے پس منظر میں سترہویں صدی کی خانہ جنگی جو پارلیمنٹ اور چارلس اول کے درمیان ہوئی، جس میں پارلیمنٹ نے فتح کے بعد بادشاہ کا غداری کے جرم میں سر قلم کر دیا۔ اس نے انگلستان کے سیاسی نظام کو ایک زبردست دھچکہ دیا اور پارلیمنٹ کی طاقت کو مضبوط کیا۔ سولہویں اور سترہویں صدی میں تھامس ہوبس (Thomas Hobes) اور جان لاک (John Lock) کے خیالات و افکار سے متبادل سیاسی نظام کی راہوں کو استوار کیا۔ اس لئے 1688ء کا انقلاب اس کے نتیجہ میں آیا اور اس نے انگلستان کے سیاسی نظام میں بادشاہ کے اختیارات کو کم کر کے، پارلیمنٹ کی اہمیت کو بڑھایا۔

امریکہ کی جنگ آزادی کے خاتمہ کے بعد، اس کے سیاسی راہنماؤں نے یونانی، اور خاص طور پر رومی ریپبلک کا گہرائی سے مطالعہ کیا، اور اس کے سیاسی نظام کو سمجھا کہ جس میں سینٹ اور اسمبلیوں کا اہم کردار تھا۔ انہوں نے یورپ کے فلسفیوں اور ان کے سیاسی نظریات کا بھی بغور مطالعہ کیا اور مان ٹسکو (Montascou) کے نظریات کے تحت مقنّنہ، عدلیہ اور انتظامیہ کو علیحدہ علیحدہ رکھا۔ ریاست اور چرچ کو بھی ایک دوسرے سے دور رکھ کر سیکولر نظام کو رائج کیا۔ لہٰذا اس دستور نے امریکہ میں جمہوریت اور سیکولرازم کی بنیادوں کو مضبوط کیا۔

فرانس کے انقلاب میں ''روشن خیال'' تحریک کے فلسفیوں اور دانشوروں کا حصہ تھا۔ اس لئے جب انقلاب آیا تو اس کے پہلے مرحلہ میں جو دستوری بادشاہت کا تھا، اس میں مان ٹسکو کے نظریات کو اپنایا گیا۔ دوسرے مرحلہ میں جو 1892ء سے 1893ء تک رہا، اس میں روسو کے افکار کو عملی جامہ پہنایا گیا۔ روسو نے اپنی کتاب معاہدۂ عمرانی میں واضح الفاظ میں کہا کہ اقتدارِ اعلیٰ عوام کے پاس ہوتا ہے۔ اس نظریہ نے جمہوری ذہن کو بنانے اور عوام کے بنیادی حقوق کی پاسداری میں اہم کردار ادا کیا۔

روس کے انقلاب میں کارل مارکس کے نظریات، لینن کے افکار اور اس کی سیاسی بصیرت کو دخل تھا۔ جس نے ایک انقلابی پارٹی کو منظّم کیا تھا۔ اس لئے جب انقلاب آیا تو اس نے روس میں ایک متبادل نظام کی تشکیل کی۔

چین میں ماؤزے تنگ نے مارکس کے خیالات کو اخذ کر کے، چین کے حالات کے تحت اس کی سیاسی، سماجی، اور معاشی زندگی کا مطالعہ کیا، اور انقلاب کے بعد یہاں بھی کمیونسٹ پارٹی ایک ایسی منظّم جماعت تھی کہ جس نے قدیم نظام کو الٹ کر اس کی جگہ ایک نئے نظام کو ترتیب دیا۔

اس لئے اس مرحلہ پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا پاکستان میں ایسے دانشور اور فلسفی و مفکر ہیں کہ جو لوگوں کے ذہن کو بدلنے کی جدوجہد کر رہے ہیں؟ اسلام اور پاکستانی معاشرے کا تجزیہ کر کے اس کی خرابیوں اور بدعنوانیوں کی جگہ کوئی متبادل نظام کا خاکہ پیش کر رہے ہیں؟

اول تو پاکستان میں دانشوری کی جڑیں بہت کمزور ہیں، جو دانشور ہیں، ان کی اکثریت موجودہ نظام کو مستحکم کرنے، اور اس سے فائدہ اٹھانے میں مصروف ہیں۔ دوسرے ان دانشوروں کی اکثریت شاعروں پر مشتمل ہے جو انقلابی ترانے اور گیت تو لکھتے ہیں، مگر انقلاب ترانوں اور

گانوں سے نہیں آتا ہے۔ حبیب جالب نے بھرپور جذبات کے ساتھ کہا کہ ایسے دستور کو، اور صبح بے نور کو میں نہیں مانتا، مگر یہ دستور بھی موجود ہے اور صبح بے نور بھی۔ ان کے گانوں کے باوجود حکمرانوں کے محلات بھی بن رہے ہیں، اور ان میں چراغاں بھی ہو رہے ہیں۔ ذہنی تبدیلی اس وقت آتی ہے کہ جب سوسائٹی میں فلسفی، مفکر اور سماجی علوم کے ماہرین پیدا ہوں، اور نئے خیالات وافکار کے ذریعہ لوگوں کی ذہنی تربیت کریں اور ایسے سیاستدان ہوں کہ جن کے پاس متبادل نظام کا خاکہ ہو۔

چونکہ پاکستان میں ہمیں نہ تو ایسے دانشور نظر آتے ہیں اور نہ ہی ایسے سیاستدان اور سماجی کارکن کہ جن کے پاس پرانے نظام کی جگہ نئے نظام کا کوئی منصوبہ ہو، اس لئے پاکستان میں انقلاب اور تبدیلی کے لئے کوئی راستہ نظر نہیں آتا ہے۔

اب رہے عوام کہ جن کی خواہش ہے کہ انقلاب آئے، بدعنوانی ختم ہو، نااہل سیاستدانوں کا خاتمہ ہو، فرسودہ ادارے اور روایات باقی نہ رہیں، تو یہ ان کی خواہشات ہیں، مگر تاریخ محض خواہشات کے تحت نہیں بنتی ہے، اس کے لئے جدوجہد کرنا پڑتی ہے۔ ذاتی مفادات سے بلند ہو کر قومی مفاد کے لئے سوچنا پڑتا ہے۔ سوسائٹی کو ایسے دانشوروں کا ساتھ دینا ہوتا ہے جو تبدیلی کے لئے کوشش کرتے ہیں، اگر انہیں تنہا اور اکیلا چھوڑ دیا جائے تو ان کے خیالات تنہائی میں دم توڑ دیتے ہیں۔ انقلاب تبدیلی کا زبردست عمل ہوتا ہے، جس کے لئے سوسائٹی کو اپنی قدامت پرستی، عقیدے کی سچائی اور روایات کے تقدس کو چھوڑنا ہوتا ہے۔

شاید پاکستانی سوسائٹی ابھی اس کے لئے تیار نہیں ہے۔

کیا شاعری سماجی تبدیلی لاسکتی ہے؟

ہر تہذیب کے ابتدائی دور میں جب کہ تحریر وجود میں نہیں آئی تھی، اس وقت شاعری کے ذریعہ اظہارِ خیال کیا جاتا تھا، چونکہ اس میں آہنگ ہوتا ہے، اس لئے اشعار کو زبانی یاد کرنا آسان ہوتا ہے۔ لہٰذا شاعری ان معاشروں میں زیادہ مقبول ہوتی ہے کہ جن کا کلچر زبانی روایات پر ہوتا ہے۔ لیکن جب معاشرہ ترقی کرتا ہے، اس میں نئے خیالات اور افکار پیدا ہوتے ہیں تو پھر ان کے اظہار کے لئے شاعری کے بجائے نثر کو اختیار کیا جاتا ہے۔ اس لئے کہا جاتا ہے کہ جب معاشرہ شاعری سے نثر کی جانب جاتا ہے، تو وہ اس کی ترقی کو ظاہر کرتا ہے۔ یونان کی تہذیب کے ابتدائی دور میں ہومر کی شاعری اس کا امتیاز تھا، مگر بعد میں ایونین (Ionian) فلسفی جنہوں نے دنیا کی تخلیق کے بارے میں نظریات دیئے، اور پھر سقراط، افلاطون، ارسطو اور دوسرے فلسفی آئے، جنہوں نے سماجی مسائل اور معاشرے کے بارے میں نئے نئے نظریات اور افکار دیئے۔ افلاطون نے اپنی کتاب ''جمہوریت'' میں شاعروں کے لئے کوئی جگہ نہیں رکھی، کیونکہ اس کے نزدیک شاعری کی بنیاد جذبات اور غیر عقلی خیالات پر ہوتی ہے۔

یورپ کی ترقی میں بھی ہم سائنسدانوں، فلسفیوں، مفکروں اور سماجی علوم کے ماہرین کا حصہ پاتے ہیں، جو معاشرے کی ذہنی حالت کو اپنے خیالات کے ذریعہ بدل رہے تھے۔

لیکن یورپ میں سماجی تبدیلی اس وقت آئی کہ جب وہاں صنعتی انقلاب آیا، اور ٹیکنالوجی نے معاشرے میں معاشی، سماجی اور سیاسی تبدیلی کی اس انقلاب کی کامیابی میں فلسفیوں، مفکروں اور معیشت دانوں کا حصہ تھا جو تبدیل ہوتے معاشرے کو نئے افکار کے ذریعہ اس کی راہنمائی کر رہے تھے۔ اس لئے آدم اسمتھ، ریکارڈو، مالتھوس، اور بعد میں کارل مارکس اور اینگلز نے سرمایہ داری اور اس سے پیدا ہونے والے مسائل کا تجزیہ کیا۔ پورے عمل میں ہمیں شاعر نظر تو آئے، مگر

انہوں نے اس انقلابی تبدیلی میں حصہ نہیں لیا۔

اس لئے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آخر شاعری کیوں سماجی تبدیلی نہیں لاسکتی؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ شاعری کا تعلق جذبات سے ہوتا ہے، وہ جذبات کو انگیختہ تو کرتی ہے مگر اس کے پاس کوئی دلیل نہیں ہوتی ہے۔ اس لئے شاعری سیاسی تحریک کے دوران لوگوں کو جذباتی طور پر ابھار تو سکتی ہے مگر انقلاب کا سبب نہیں بن سکتی ہے۔

موجودہ دور میں ٹیکنالوجی کی اہمیت بہت زیادہ ہوگئی ہے، اس لئے ہم دیکھتے ہیں کہ ایک اہم ایجاد پوری سوسائٹی اور اس کے ڈھانچہ کو بدل کر رکھ دیتی ہے۔ ہمارے اپنے زمانے میں کمپیوٹر، ای میل، سیل فون، اور فیکس وغیرہ کی ایجادات نے نہ صرف معاشرے کو سماجی طور پر بدلا ہے، بلکہ انسانی رویوں اور عادات کو بھی تبدیل کر کے رکھ دیا ہے۔ اس وقت ٹیکنالوجی اور اس کی ایجادات میں اس قدر تیزی آئی ہوئی ہے کہ لوگوں کو اس کے ساتھ تبدیل ہونے میں دقت پیش آرہی ہے۔ مگر سماجی تبدیلی اس ٹیکنالوجی کی وجہ سے آرہی ہے۔ اس سے پہلے مفکرین اور سماجی علوم کے ماہرین کے خیالات کو اولین حیثیت ہوتی تھی، اور ٹیکنالوجی کی ایجادات ان سے متاثر ہوتی تھیں، مگر اب ٹیکنالوجی کو اول حیثیت حاصل ہوگئی ہے اور خیالات وافکار اس کے تابع ہو گئے ہیں۔

لیکن جن معاشروں میں ٹکنالوجی کو حاصل کر لیا جاتا ہے، مگر اس کے نتیجہ میں ہونے والے عمل کو سمجھنے کے لئے ذہن تبدیل نہیں ہوتے ہیں۔ ایسے معاشرے تہذیبی طور پر اور زیادہ پس ماندہ ہو جاتے ہیں، ٹیکنالوجی تو ہے، مگر وہ خیالات وافکار نہیں کہ جو ٹیکنالوجی کے عمل کو سمجھ سکیں۔

پاکستانی معاشرے کا المیہ یہ ہے کہ یہاں ایک طرف تو شاعروں کو ہی دانشور سمجھا جاتا ہے۔ لبرل اور ترقی پسند خیالات کے لوگ بھی انقلابی شاعری کو پڑھ کر یا سن کر جھوم جاتے ہیں اور ان خوابوں میں گم ہو جاتے ہیں کہ انقلاب آنے والا ہے، یعنی شاعروں کے گیتوں اور نغموں سے انقلاب آجائے گا، اس کے لئے انہیں کچھ کرنے کی ضرورت نہیں ہے، لیکن ان کا یہ انقلاب شاعروں کے دیوانوں اور ان کو گانے والوں کے کیسٹ میں گم ہو جاتا ہے۔

حبیب جالب انقلابی شاعر تھے، اور ان کی شاعری آج بھی لوگوں کے جذبات کو ابھارتی ہے، اس سے زیادہ نہیں مثلاً ان کی مشہور نظم کے ''ایسے دستور کو، صبح بے نور کو میں نہیں مانتا'' یہ اشعار تو ٹھیک ہیں، مگر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ کون سا دستور؟ اور اس دستور میں کیا خرابی تھی کہ جس کی وجہ

سے وہ اس کو ماننے سے انکاری تھے؟ محض اس نظم سے دستور اس کی دفعات اور اس کے اثرات کے بارے میں کچھ پتہ نہیں ہوتا ہے، لوگ جذباتی ہو کر نعرے لگا دیتے ہیں، مگر نتیجہ کچھ نہیں نکلتا ہے۔

اسی طرح فیض صاحب کی نظم ''ہم بھی دیکھیں گے'' بڑی انقلابی اور جذباتی ہے، لوگ اس کے انتظار ہی میں ہیں کہ جب تخت گرائے جائیں گے اور تاج اُچھالے جائیں گے، اگر ان نظموں کو اچھا گانے یا گانے والی ہو تو پھر یہ محض تفریح کا حصہ بن کر رہ جاتی ہیں۔ یہ نہ تو لوگوں کے ذہن کو بدلتی ہیں، اور نہ معاشرے میں کوئی سماجی تبدیلی کا باعث ہوتی ہیں۔

اس پس منظر میں اگر پاکستان کے معاشرہ کو ترقی کا راستہ اختیار کرنا ہے تو اول تو اس کے لئے نئی ٹیکنالوجی کا حصول ہوگا، مگر محض ٹیکنالوجی کا حصول کافی نہیں ہے اس کی ایجادات میں بھی حصہ لینا ہوگا، تاکہ اس کا انحصار دوسرے ملکوں پر نہ ہو بلکہ ہمارے سائنسدان نئی ایجادات کے بعد ہماری بنیاد کو مضبوط بنائیں، اس کے بعد جب ہم سماجی تبدیلی کی بات کرتے ہیں تو اس سے ہمارا مطلب یہ ہوتا ہے کہ ایسی تبدیلی جو سماجی رویوں، عادات، ماحول، زبان اور روزمرہ کی زندگی پر اثر انداز ہو۔ یہ سماجی تبدیلی ٹیکنالوجی کی ایجادات کے سبب ہو رہی ہے، شاعری کا اس تبدیلی میں کوئی دخل نہیں ہے۔ اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ شاعری جذبات کو ابھارنے اور تفریح کا ایک ذریعہ تو ہے، مگر اس کے ذریعہ کوئی بنیادی تبدیلی نہیں ہوسکتی ہے۔ یہ تبدیلی سائنس اور ٹیکنالوجی کی ایجادات لے کر آتی ہیں۔ لیکن اس کے ساتھ ہی ان تبدیلیوں کو سمجھنے کے لئے نئے نظریات اور افکار کو پیدا کرنا ہوتا ہے جو سماجی تبدیلی سے ہونے والے مسائل کو سمجھ سکیں۔ اس لئے سائنس دانوں اور مفکروں کو ساتھ ساتھ چلنا ہوتا ہے تاکہ ٹیکنالوجی کے اثرات سے معاشرے میں انسانی احساسات کا خاتمہ نہ ہو۔ نئی فکر ان کے ذہنوں کو تازگی دیتی رہے۔ اس مرحلہ پر شاعری انسان کے جمالی احساسات کو پرورش کرنے اور زندہ رکھنے میں ایک موثر ذریعہ ضرور ہے جو اسے فطرت کے قریب پہنچا کر سکون دیتی ہے لیکن محض شاعری معاشرے میں سیاسی شعور اور تبدیلی کا ذریعہ نہیں ہوتی۔

ترقی کا راستہ

طبقاتی معاشرے میں فرد کا مقام اور اس کی ذات کی شناخت اس کے طبقہ سے ہوتی ہے۔ اس طبقاتی شعور میں خاندان کا اہم کردار ہوتا ہے۔ فرد کا تعلق اس کے خاندان سے ہے، یہ معاشرے میں اس کے وجود کا تعین کرتا ہے۔ خاندان سے منسلک ہمیشہ جائیداد کا تصور ہوتا ہے۔ صاحب جائیداد کی حیثیت قابل تعظیم اور احترام ہوتی ہے، جو جائیداد سے محروم ہوتے ہیں وہ عوام کے جم غفیر میں شامل ہو جاتے ہیں۔ خاندان سے تعلق رکھنے والے نہ صرف اس جائیداد کے وارث ہوتے ہیں کہ جو ان کے خاندان کی ملکیت ہے، بلکہ وہ یہ بھی دعویٰ کرتے ہیں کہ ان کے خاندان میں ذہانت، لیاقت، اور صلاحیت فطری طور پر موجود ہیں اور یہ اوصاف ان میں بطور میراث آ جاتے ہیں، اس وجہ سے وہ دوسرے افراد سے مختلف ہوتے ہیں۔ لہٰذا جائیداد، ملکیت اور خاندانی اوصاف اور خون کی پاکیزگی کی بنیاد پر اشرافیہ کا طبقہ تشکیل ہوتا ہے۔ ماضی میں یہ امراء بھی کہلاتے تھے، اور ان خوبیوں کی وجہ سے ریاست کے تمام اہم عہدے ان کے پاس ہوتے تھے۔ اپنے اعلیٰ رتبہ کی وجہ سے ان کو یہ مواقع حاصل تھے کہ یہ اعلیٰ تعلیم و تربیت حاصل کر سکیں اور اس حیثیت سے حکمران طبقے میں شمولیت کے حقدار ہوں۔

لیکن تاریخ میں ہوا یہ ہے کہ جب ایک طبقہ کو تمام مراعات اور سہولتیں مل گئیں تو ان میں محنت کرنے اور اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو ابھارنے کی ضرورت نہیں رہی، اور یہ طبقہ آہستہ آہستہ اپنے اوصاف بھی کھوتا رہا اور نظام کو بھی زوال پذیر کرتا رہا۔

سترہویں صدی کا انگلستان اس صورت حال سے دوچار تھا۔ لہٰذا اس مرحلہ پر اس کے فلسفی جان لاک (John Lock) نے یہ نظریہ پیش کیا کہ ہر فرد جب پیدا ہوتا ہے تو اس کا ذہن صاف و شفاف سلیٹ کی مانند ہوتا ہے۔ وہ پیدائشی طور پر کچھ لے کر نہیں آتا ہے اس لئے معاشرہ اسے جو کچھ تعلیم دیتا ہے، حالات جو کچھ سکھاتے ہیں وہ اس کے دل و دماغ پر نقش ہوتا رہتا ہے۔

اس کا مطلب یہ تھا کہ اگر ریاست اور معاشرہ فرد کو اچھی تعلیم دے، اسے بہتر ماحول مہیا کرے تو فرد اپنی ذہانت کو ابھار کر اسے تحقیقی کاموں میں استعمال کر سکتا ہے۔ اس کا دوسرا مطلب یہ تھا کہ ذہانت، لیاقت اور صلاحیت کسی کی ذاتی میراث نہیں ہوتی ہے۔ یہ ہر طبقے کے فرد میں موجود ہوتی ہے اس لئے اگر اس کو بہتر ماحول دیا جائے تو اس میں یہ پروان چڑھتی ہے۔

جان لاک کے اس نظریہ کی وجہ سے انگلستان اور یورپ کی ریاستوں نے تعلیم و تربیت اور آگے بڑھنے کے مواقع ہر فرد کے لئے کھول دیئے، دوسرے انہوں نے اصلاحات کا عمل شروع کیا تاکہ فرد کو آزادی کے ساتھ اپنی صلاحیتوں کو ابھارنے کا موقع ملے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اشرافیہ یا امراء کی اجارہ داری پر کاری ضرب لگی، اور انگلستان کے معاشرے کو عام لوگوں کی جانب سے ایک نئی توانائی اور قوت ملی، جس نے اسے ترقی دینے، آگے بڑھانے میں حصہ لیا۔ اس لئے ہم دیکھتے ہیں کہ انگلستان کے صنعتی انقلاب میں عام شہریوں کا حصہ ہے۔ ٹیکنالوجی کی تمام ایجادات سائنسدانوں کی جانب سے نہیں ہوئیں بلکہ عام کاریگروں اور ہنر مندوں کے ہاتھوں سے ہوئیں۔ انگلستان اور یورپ میں اس نظریہ کے تحت اصلاحات کا سلسلہ شروع ہوا تو اس نے عام لوگوں کی زندگی کو بہتر بنانے میں مدد دی۔ تعلیم، صحت اور بنیادی سہولتوں نے لوگوں کی زندگی کو بدل کر رکھ دیا، اس کا اثر معاشرے کی ترقی پر ہوا۔

اس صورت حال کو ذہن میں رکھتے ہوئے جب ہم پاکستان کے معاشرے کا تجزیہ کرتے ہیں، تو ہمارے سامنے یہ سوچ پیدا ہوتی ہے کہ ایک طرف تو جاگیردار اور قبائلی سردار ہیں کہ جو سیاست پر قابض ہیں، دوسری طرف کولونیل دور کی اشرافیہ ہے کہ جو انگریزی اور اعلیٰ تعلیم پر قابض ہے۔ اس وجہ سے یہ دو طبقے ریاست کے اداروں پر قابض ہیں۔ عام لوگ تمام مراعات اور بنیادی سہولتوں سے محروم غربت، مفلسی اور بے بسی کی زندگی گزار رہے ہیں۔

اس وقت پاکستان میں جس قسم کا تعلیمی نظام ہے، اس میں انگریزی میڈیم تعلیمی اداروں میں اشرافیہ اور دولت مند طبقوں کا قبضہ ہے۔ یہ نوجوان او یا اے لیول کے بعد اعلیٰ تعلیم کے لئے باہر چلے جاتے ہیں، اور پھر وہیں آباد ہو جاتے ہیں، یا ملک میں نجی کمپنیوں اور ریاست کے اعلیٰ عہدوں پر فائز ہو جاتے ہیں۔

ملک کی اکثریت جو اردو میڈیم اسکولوں یا مدرسوں میں تعلیم حاصل کر رہی ہے ان کے لئے

اعلیٰ تعلیم کے مواقع محدود ہیں اور نہ ہی نجی کمپنیوں اور ریاست کے مقابلے کے امتحانوں میں کامیابی کے امکانات ہوتے ہیں، لہٰذا یہ نوجوان اچھی تعلیم سے محروم اور بیروزگاری کا شکار ہو کر اپنے خاندان پر بوجھ بن جاتے ہیں۔ یہی وہ نوجوان ہیں کہ جو مذہبی تشدد کے راستے کو اختیار کرتے ہیں یا جرائم اور نشہ میں ملوث ہو جاتے ہیں۔

پاکستان کے معاشرے کی پس ماندگی کا اگر تجزیہ کیا جائے تو یہ بات ہمارے سامنے آتی ہے کہ اس میں پیشہ ور، ہنرمند اور تربیت یافتہ افراد کی کمی ہے۔ ہمارے پاس نہ تو سائنسدان ہے کہ جو ضرورت کے مطابق ایجادات کر سکیں، نہ ہی ایسے انجینئر اور مستری ہیں کہ جو نئی مشینوں کے استعمال کو رواج دیں، نہ ہی سماجی علوم کے ماہرین ہیں کہ جو معاشرے کے مسائل کو سمجھ کر ان کا حل پیش کر سکیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے حکمران طبقے بجائے اس کے کہ ملک میں اچھے اسپتالوں کو قائم کریں، اپنا علاج کرانے بیرون ملک چلے جاتے ہیں۔ اچھے اور معیاری تعلیمی اداروں کے قیام کے بجائے یہ اپنی اولاد کو باہر کے ملکوں میں روانہ کر دیتے ہیں۔

المیہ یہ ہے کہ یہ نوجوان اپنے معاشرے اور عوام کے مسائل سے بے خبر جب آکسفورڈ اور ہارورڈ کی ڈگریاں لے کر آتے ہیں تو انہیں سیاسی جماعتیں ملک کا سربراہ بنا دیتی ہیں، اور یہ بے خبر راہنما ملک اور عوام کا استحصال کرتے ہیں، اور دولت سمیٹ کر بیرون ملک چلے جاتے ہیں۔

پاکستان کے معاشرے کی اس پس ماندگی کا حل موجود ہے۔ وہ حل یہ ہے کہ جان لاک کے نظریہ کو اپناتے ہوئے عام لوگوں کو پورا پورا موقع ملنا چاہئے کہ وہ اعلیٰ تعلیم اور تربیت حاصل کر سکیں۔ اگر عوام کے لئے یہ سہولتیں ہوں تو عام لوگوں میں جو توانائی اور صلاحیت ہے وہ پوری طرح ابھر کر سامنے آئے گی اور معاشرے کو ایک نئی زندگی ملے گی۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ عوام کو خوشگوار ماحول دینے کے لئے ریاست کی یہ ذمہ داری ہے کہ وہ اصلاحات کے ذریعہ اس کے فرسودہ اداروں اور روایات کو ٹھیک کرے۔ اچھی تعلیم اور بہتر ماحول عام لوگوں کی زندگی کو بدل سکتا ہے اور یہ معاشرے کی ترقی کے لئے ضروری ہے۔ مگر یہ اسی وقت ممکن ہے کہ جب جاگیردار اور قبائلی سردار اور اشرافیہ اپنی مراعات چھوڑنے پر آمادہ ہو۔ بعض حالات میں ان سے یہ مراعات زبردستی چھینی جاتی ہیں بعض اوقات وہ خود حالات کی سنگینی کا احساس کر کے ان سے دست بردار ہو جاتے ہیں، اور ملک کے مفاد میں عام لوگوں کو آگے بڑھنے کے مواقع دیتے ہیں۔

کیا تہذیب ترقی کی علامت ہے؟

فرانس کی ایک اکیڈمی نے مقابلہ مضامین کا اعلان کرتے ہوئے، اس موضوع پر مضامین طلب کئے کہ ''کیا تہذیب نے انسان کو پس ماندہ بنایا ہے؟'' روسو نے جو اس وقت مشہور نہیں تھا اور ایک گمنام شخص تھا، اس پر اپنا مضمون مقابلہ کے لئے بھیجا، اس پر اسے پہلا انعام ملا، اور ساتھ ہی میں اس کی شہرت بھی ہوئی۔ روسو نے مضمون میں جس نقطہ نظر کو اختیار کیا وہ یہ تھا کہ انسان کی تاریخ میں، ابتدائی دور کہ جس کو شکار اور غذا جمع کرنے کا کہا جاتا ہے، اس وقت وہ فطرت سے قریب تھا، اس کی فطرت سے ہم آہنگی تھی، محبت تھی، اور دوستی تھی۔ اس عہد میں نہ تو نجی جائیداد کا سوال تھا، اور نہ ہی اس کی وجہ سے لوگوں میں نفرت وعداوت اور دشمنی تھی۔ لیکن انسان اور فطرت کے درمیان جیسے جیسے فاصلے بڑھتے چلے گئے اس کے ذہن، عادات، اور رویوں میں تبدیلی آتی چلی گئی۔ تاریخ میں جس عمل کو تہذیب کہا جاتا ہے، اس نے آہستہ آہستہ انسان اور فطرت کو دور کر کے ان کو مد مقابل بنا دیا۔ اس لئے ہم دیکھتے ہیں کہ جب انسان نے آبادیاں بسائیں، اور کھیتی باڑی شروع کی تو زمین کے حصول کے لئے جنگلوں کا صفایا کرنا شروع کر دیا، درختوں کو کاٹ کر زمین کو ہموار کیا تاکہ زراعت کو فروغ دے۔ اس کے ساتھ ہی نئے اوزار، ہتھیار، اور آلات کا استعمال کرنا شروع کر دیا۔ تاریخ کے اس عمل میں انسان برادریوں اور قبیلوں میں تقسیم ہوا۔ ہتھیاروں کی ایجاد نے اسے جنگ پر آمادہ کیا، جس کا مقصد یہ تھا کہ خود پیداوار نہ کریں اور دوسروں کی پیداوار پر زبردستی قبضہ کریں۔ اس کے نتیجہ میں دوستی اور محبت کی جگہ دشمنی اور عداوت کے جذبات پیدا ہوئے۔

جب قبیلوں اور قوموں میں طاقت اور اقتدار کی خواہشات پیدا ہوئیں تو انہوں نے فطرت کے ذرائع کو استعمال کرنا شروع کیا۔ معدنیات کی کانوں سے تانبا، پیتل، لوہا، اور دوسری

معدنیات نکالنی شروع کیں، تا کہ ان کو استعمال کر کے مضبوط آلات اور اوزار بنائیں اور ان کی مدد سے طاقت کو حاصل کریں۔ نجی جائیداد کے ادارے کے قیام میں آنے کے بعد خاندان کی شکل بدل گئی۔ اب جائیداد کو خاندان میں مستقل کرنے کا جذبہ پیدا ہوا کہ جو میراث کی شکل اختیار کر گیا۔ بقول اینگلز کہ نجی جائیداد اور اس کے وارث پیدا کرنے کی ذمہ داری عورت پر آ پڑی، اس لئے عورت کے لئے باعصمت ہونا لازمی ہو گیا تا کہ وارث کا تعلق اسی خاندان سے ہو۔ وراثت کے جو جھگڑے شروع ہوئے، جو جنگیں اور قتل و غارت گری ہوئی، اس کا سلسلہ اب تک جاری ہے۔ اس لئے روسو کے بقول نجی جائیداد کا ادارہ فطرت کے خلاف ہے، اس کے قیام نے انسان کو بربریت کی جانب دھکیل دیا۔

انسانی تہذیب کی ترقی میں معدنیات کا بڑا حصہ ہے، پتھر کے ہتھیاروں اور آلات کے بعد، کانسی اور لوہے کے ہتھیار اور اوزار بنائے جانے لگے تو ان کی تلاش میں کانیں کھود کر ان معدنیات کو نکالنا شروع کیا، اس کے بعد کوئلے کو بطور ایندھن اور صنعت میں استعمال کرنا شروع کیا تو اس کی کانیں دریافت ہوئیں، اس کے بعد سونا اور چاندی کو بطور کرنسی شروع کیا، تو زمین کے اوپر ایک اور آفت آ گئی۔ اب صورت حال یہ ہے کہ انسان نے معدنیات کے حصول کے لئے زمین کو کھود کھود کر کھوکھلا کر دیا ہے۔

اگر روسو کی دلیل کو صحیح تسلیم کر لیا جائے، اور تہذیب کا تجزیہ کیا جائے تو ہم اس نتیجہ پر پہنچتے ہیں کہ تہذیب کے ارتقاء کے ساتھ کس طرح سے انسانی سماج میں تبدیلیاں آئیں۔ ابتدائی دور میں انسانوں کے درمیان کوئی تفریق نہیں تھی، عورتوں اور مردوں کے درمیان فرق نہیں تھا مگر تہذیب کے ارتقاء کے ساتھ ریاست کا ادارہ وجود میں آیا۔ اس میں جنگ جو طبقہ نے طاقت و اقتدار کے حصول کے بعد اپنی مراعاتی حیثیت کو قائم کر لیا۔ مذہبی طبقہ نے روحانی اجارہ داری کے نام پر لوگوں کے دل و دماغ پر حکومت کرنی شروع کر دی، عام لوگ کاریگروں، ہنرمندوں، مزدوروں اور کسانوں میں بٹ گئے۔ سماج اس طرح غیر مساویانہ طور پر تقسیم ہوا کہ وہ سلسلہ آج تک جاری ہے، اور آج بھی انسان کے ذہن میں برابری اور مساوات کا جذبہ ابھرتا رہتا ہے جو اس کے ابتدائی دور کی پیداوار تھا۔ اس لئے ہر انقلاب جو مساوات کا نعرہ لگاتا ہے تو وہ لوگوں میں ایک نئی امید اور نئی زندگی کو پیدا کرتا ہے۔

یورپ میں جب سولہویں اور سترہویں صدی میں ترقی کا نظریہ پیدا ہوا تو اس نظریہ نے یورپ کی قوموں میں زبردست مقابلہ کا جذبہ پیدا کیا۔ اس جذبہ نے امپیریل ازم یا سامراجیت کو جنم دیا، اور یورپ کی اقوام ایشیا و افریقہ اور امریکہ کے ملکوں میں جا پہنچے جہاں انہوں نے بیدردی سے نہ صرف ان کے فطری ذرائع پر قبضہ کر کے انہیں اپنی ترقی کے لئے استعمال کیا، اور ان ملکوں کو پس ماندہ بنایا۔ یورپی طاقتوں کے اس نوآبادیاتی دور میں ایشیا و افریقہ کے ملکوں کی معدنیات، ان کی فصلیں، یہ سب انہوں نے اپنی ترقی کے لئے استعمال کیں۔

جب انگلستان میں صنعتی انقلاب آیا تو اس کے بعد فطری ذرائع کو استعمال کرنے کا اور زیادہ رواج ہو گیا۔ نوآبادیات سے خام مال یورپی ملکوں میں آنے لگا، اور فیکٹریوں نے جہاں ماحول کو آلودہ کر کے فطرت کی خوبصورتی کو ختم کیا، وہیں انسانی توانائی کو سرمایہ دارانہ نظام میں استحصالی حربوں کے ساتھ استعمال کر کے مزدوروں کو زندگی کی خواہشوں سے محروم کر دیا۔ ترقی کے نام پر لالچ، طمع اور مقابلہ کی جو دوڑ شروع ہوئی، وہ معاشرے کے طبقات میں تھی اور قوموں میں بھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پہلی اور دوسری جنگوں نے اس ترقی کی تباہی کو دنیا کے سامنے آشکار کر دیا کہ کس طرح نئے ہتھیاروں نے دنیا کو تباہ کرنے میں حصہ لیا۔

ستم ظریفی یہ ہے کہ یورپی اقوام نے اپنے سیاسی اور معاشی تسلط کے لئے تہذیب کو استعمال کیا۔ جب امریکہ میں اہل یورپ نے مقامی باشندوں کی سرزمین پر قبضہ کیا، یا افریقہ اور ایشیا کے ملکوں میں اپنے اقتدار کو قائم کیا تو یہ کہا کہ وہ ان ملکوں کے لوگوں کو مہذب بنانے آئے ہیں۔ آج بھی امریکہ کا نعرہ یہی ہے کہ وہ دنیا میں جمہوریت کے فروغ کے لئے فوجی دخل اندازی کر رہا ہے۔ دنیا کی تاریخ میں تہذیب کی ترقی، اور اس کے پھیلاؤ کے ساتھ جو کچھ ہوا، دنیا جس انداز سے بدلی، کیا ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس تہذیبی ترقی نے انسان کو خوشی و مسرت دی؟

روسو اس کا مخالف ہے۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ جب انسان سادہ زندگی گزارتا تھا، وہ فطرت کے حسن اور خوبصورتی سے متاثر ہوتا تھا۔ تہذیب نے اسے زندگی کی پیچیدگیوں میں مبتلا کر کے رکھ دیا ہے۔ شہروں کی آبادیوں نے اسے فطرت سے دور کر دیا ہے، وہ جنگل کی صاف فضا، پرندوں کی چہچہاہٹ اور ان کی خوبصورت آوازوں سے محروم ہو گیا ہے۔ وہ دریا کے پُرسکون پانی، آبشاروں کی موسیقی سے بیگانہ ہو گیا ہے۔ اس لئے روسو نے عقلیت پرستی کی تحریک کے بجائے، رومانوی

تحریک کا ساتھ دیا کہ جس میں فطرت سے لگاؤ اور محبت ہے۔

روسو نے اپنی زندگی کو اپنے نظریات کے مطابق گذارا، اس نے نہ تو کوئی جائیداد بنائی، نہ دولت کمائی۔ آخر عمر میں اس کا گذارا موسیقی کے مخطوطات کو خوش خطی سے لکھ کر روزی حاصل کرنا ہوتا تھا۔ اس کا کھانا روٹی اور پنیر ہوتا تھا بقیہ وقت وہ کشتی میں بیٹھ کر دریا کی خاموش لہروں میں اور گھنے درختوں میں فطرت کے حسن اور خوبصورتی سے لطف اندوز ہوتا تھا۔

اس لئے آج کے اس سرمایہ دارانہ معاشرہ میں یہ سوال اہمیت کا حامل ہے کہ کیا انسان اپنی تمام توانائی دولت کے حصول میں صرف کردے، اور فطرت کی خوبصورتی سے دور ہو جائے۔ روسو نے زندگی میں سادگی کا راستہ دکھایا، کہ جس میں ذہنی سکون ہے۔

سماجی ناہمواری

تہذیب کے ابتدائی دور سے انسانی سماج میں طبقاتی تقسیم شروع ہوئی جس نے سماجی ناہمواری کی بنیاد ڈالی۔ ابتدائی دور میں جنگجوؤں کا طبقہ تھا، جس کے فرائض میں لوگوں کا دفاع کرنا تھا۔

یہ طبقہ فوجی لحاظ سے طاقت ور اور مضبوط تھا، چونکہ اس کے پاس ہتھیار ہوتے تھے اس لئے دوسرے طبقوں کے مقابلہ میں اس کی زیادہ اہمیت ہوگئی تھی۔ اس کے بعد دوسراا ہم طبقہ پجاریوں یا مذہبی راہنماؤں کا تھا، جن کی ذمہ داری تھی کہ وہ لوگوں کو دیوتاؤں کے قہر اور عذاب سے محفوظ رکھنے اور ان کی خوشنودی کے لئے دعائیں مانگیں گئے، قربانیاں کریں گے اور عبادت کے ذریعہ ان کو خوش رکھیں گے۔ اس طبقہ کی طاقت روحانیت میں تھی، اور لوگ انہیں دیوتاؤں کے قریب سمجھتے ہوئے ان کی عزت و احترام کرتے تھے۔ ان دو طبقوں کے بعد عام لوگ تھے جن میں کسان، کاریگر، مزدور اور محنت کش لوگ تھے، جو اپنی محنت سے پیداواری عمل میں حصہ لیتے تھے اور اس پیداوار کے ذریعہ ان دو طبقوں کو ان کے فرائض ادا کرنے کا وقت دیتے تھے۔ یہ دونوں طبقے اپنی زندگی کا انحصار تیسرے طبقے یعنی عام لوگوں کی محنت پر کرتے تھے۔

تہذیب کی ترقی کے ساتھ سماجی ناہمواری کا عمل نہ صرف اور آگے بڑھا بلکہ اس کو استحکام بھی ملا۔ اس کی ایک شکل کلاسیکل دور میں یونان اور روم کے معاشرے تھے کہ جہاں غلامی کا رواج تھا۔ یہ غلام جنگوں میں شکست کھانے والے ہوتے تھے، جنہیں بطور قیدی لایا جاتا تھا اور پھر غلام بنا کر ان سے محنت و مشقت اور دوسرے کام لئے جاتے تھے۔ قدیم یونان میں ان لوگوں کو بھی غلام بنالیا جاتا تھا کہ جو قرض ادا کرنے کی سکت نہیں رکھتے تھے اور خود کو اس کے عوض غلام بن کر اس کی ادائیگی کرتے تھے۔ غلامی کے اس ادارے کی وجہ طبقہ اعلیٰ کہ جس کے پاس دولت تھی، انہیں محنت و

مشقت سے نجات مل گئی، اس لئے یونان کے فلسفیوں اور مفکروں نے بھی غلامی کے ادارے کی تعریف کی۔ بقول ارسطو اس ادارے کی وجہ سے طبقہ اعلیٰ کے افراد کو فرصت مل گئی کہ وہ تخلیقی کاموں میں اپنا وقت صرف کریں، فلسفہ، آرٹ، فن تعمیر، شعر و شاعری میں اضافہ کریں، اور حکومت کے لئے پورا پورا وقت دے کر نظام کو مضبوط کریں۔

رومیوں نے چونکہ ایک وسیع سلطنت کی بنیاد رکھی جس کے لئے وہ مسلسل جنگوں میں رہے اس لئے ان کے ہاں غلاموں کی بڑی تعداد تھی، جو زراعت، معدنیات کی کانوں اور زندگی کے دوسرے شعبوں میں محنت و مشقت کے ذریعہ رومی معاشرے کی ضروریات کو پورا کرتے تھے۔

جب رومی سلطنت کا زوال ہوا، اور غلامی کا ادارہ کمزور ہوا تو یورپ میں اس کی جگہ جاگیرداری نظام آیا، جس میں جاگیردار طبقے کے پاس زمین کی ملکیت تھی اور اس ملکیت کے تحفظ کے لئے اس کے فوجی ملازم تھے جو اس کی طاقت و قوت کو مستحکم کئے ہوئے تھے۔ زمین پر کھیتی باڑی کرنے والے سرف (Serfs) کہلاتے تھے، جو ایک طرح سے جاگیردار کی ملکیت ہوتے تھے۔ یہ تین دن بغیر اجرت کے اس کی زمینوں پر کام کرتے تھے اور باقی دنوں میں اپنی زمینوں پر۔ سرکاری ملازمین کی طرح سرف غلام تو نہیں تھے، مگر یہ اپنی مرضی سے کہیں آ جا نہیں سکتے تھے۔ ایک طرح سے یہ جاگیردار کی ملکیت ہوتے تھے۔

ہندوستان میں ذات پات کا نظام تھا۔ اس میں چار ذاتیں تو ایک دوسرے سے جڑی ہوئی تھیں مگر اچھوت لوگ، جو اب دلت کہلاتے ہیں، یہ ان چار ذاتوں سے باہر تھے اور چاروں ذاتوں کے لوگ ان سے دور رہتے تھے۔ ذات پات کا فرق اس قدر سخت تھا اور مذہبی عقائد نے اس کو پورا پورا جواز فراہم کر دیا تھا کہ جو جس ذات میں پیدا ہو گیا ہے، اب یہ اس کا دھرم ہے کہ وہ اس ذات میں رہتے ہوئے اس کے جو فرائض ہیں، انہیں پورا کرے تاکہ اگلے جنم میں اس کا اسے صلہ مل جائے، اس وجہ سے ہندو مفکرین ذات پات کی تعریف کرتے ہیں کہ اس نے معاشرے میں کسی سماجی بغاوت، انتشار اور بے ترتیبی کو پیدا نہیں ہونے دیا۔ ہر ذات کا فرد اپنی ذات پر مطمئن رہا، اور معاشرے میں امن و امان اور سکون رہا۔ یہاں نہ تو غلاموں کی طرح بغاوتیں ہوئیں، اور نہ ہی کسانوں کی طرح جاگیرداروں کے خلاف مہم جوئی۔

چین میں کنفیوشس نے معاشرے کے استحکام کے لئے جو افکار دیئے ان میں اہرام کی طرح طبقوں پر وفاداری اور خدمت کرنے کے جذبات کو پیدا کیا۔ مثلاً خاندان میں باپ کی حیثیت، سربراہ کی ہوتی تھی، اس کے گھر والوں کی یہ ذمہ داری تھی کہ وہ اس کا احترام کریں اور اس کے احساسات کو پورا کریں۔ اس طرح سے حکمران طبقوں کی وفاداری عام لوگوں کے لئے لازمی تھی، اور امراء اور رعایا کے لئے بادشاہ یا حکمراں کا وفادار ہونا ضروری تھا۔ کنفیوشس کی تعلیمات کا اثر تھا کہ چین میں اعلیٰ وادنیٰ کی تقسیم میں، کم تر لوگوں کے فرائض میں تھا کہ اپنے سے برتر افراد کی حاکمیت کو تسلیم کریں۔ اس کا مقصد یہ تھا کہ لوگوں میں برتر، اعلیٰ، افضل اور حکمراں طبقوں کے خلاف نہ تو نفرت کے جذبات ہوں، اور نہ وہ بغاوت کریں۔ تا کہ معاشرے میں امن و امان رہے، اور اس کا استحکام نہ ٹوٹے۔

بادشاہت کے ادارے کے ساتھ امراء کا طبقہ وجود میں آیا جنہیں جاگیریں دی گئیں تھیں تا کہ وہ فوج رکھ سکیں اور بوقت ضرورت بادشاہ کی مدد کر سکیں۔ امراء کا یہ طبقہ خاندانی حیثیت اختیار کر گیا۔ اس میں فرد کی پیدائش اس کے رتبہ اور حیثیت کا تعین کرتی تھی۔ اس لئے امراء کے خاندان اپنے خاندانی شجروں کے ذریعہ اپنے حسب ونسب کو برقرار رکھتے تھے۔ دوسری جانب کم تر طبقے کے افراد کی پیدائش ان کو اس طبقہ میں محدود رکھتی تھی۔ سماجی حیثیت اور رتبہ کا تعین، پیدائش اور خاندان سے ہوتا تھا مال و دولت سے نہیں۔ کیونکہ اکثر بدلتے ہوئے حالات میں کاریگر یا تاجر طبقے، دولت مند ہو جاتے تھے مگر ان کی سماجی حیثیت وہی رہتی تھی۔ مثلاً ہندوستان میں عہد سلاطین میں جب ترک ہندوستان میں نئی ٹیکنالوجی لے کر آئے تو اس کے نتیجہ میں کاریگر اور ہنرمند طبقے دولت مند ہو گئے، مگر خاندانی لوگوں نے اپنی مراعات یافتہ پوزیشن کو برقرار رکھتے ہوئے ان لوگوں کو مساوی حیثیت نہیں دی۔ ضیاءالدین برنی، تاریخ فیروز شاہی کے مصنف کے ہاں ان افراد کے خلاف سخت نفرت کے جذبات ملتے ہیں۔ اس کے بقول کم تر، ذلیل، اور کم اصل لوگ چاہے کتنے ہی ذہین اور لائق ہوں، انہیں حکومت کے اعلیٰ عہدوں پر مامور نہیں کرنا چاہئے اور ان کی اصل حیثیت میں رکھنا چاہئے۔

ہندوستان میں ذات پات کی اس تفریق میں پیدائش فرد کی ذات کا تعین کر دیتی تھی، اور اس کے لئے کوئی مواقع نہیں تھے کہ وہ اپنی ذات کو بدل سکے اور اعلیٰ ذات میں شامل ہو سکے۔ چین

میں اگر کوئی فرد چاہے اس کا تعلق نچلی ذات سے کیوں نہ ہو، اگر وہ سول سروس کے مقابلہ پر امتحان میں کامیاب ہوجاتا تھا تو اسے حکمران طبقے میں شامل کر لیا جاتا تھا۔

موجودہ زمانے میں اگرچہ خاندان اور پیدائش کے دعویٰ کمزور ہو گئے ہیں، مگر ہمارے ہاں اب تک ذات پات کی تفریق موجود ہے، اور خاص طور سے سیدوں میں نجیب الطرفین ہونے کا فخر اب بھی پایا جاتا ہے لیکن وقت کے ساتھ سماجی ناہمواری تو کمزور ہو رہی ہے، مگر معاشی ناہمواری بڑھ رہی ہے۔ امیر و غریب کے درمیان فرق کم تر ہو رہا ہے، اس معاشی ناہمواری میں تبدیلی آتی رہتی ہے، حالات امیر کو غریب اور غریب کو امیر بناتے رہتے ہیں۔ خاص طور پر سرمایہ دارانہ نظام میں کہا جاتا ہے کہ چیتھڑوں میں ملبوس شخص اپنی محنت، دیانت، سازش، حیلہ، فریب اور دھوکے سے دولت حاصل کر کے بڑا سرمایہ دار بن سکتا ہے۔ جیسا کہ امریکہ میں ان سرمایہ داروں کو ڈاکوؤں کے سردار (Baron Bandits) کہا جاتا تھا۔

سرمایہ دارانہ نظام میں معاشرے میں غیر مساوی مرتبہ یا نابرابری کو ضروری سمجھا جاتا ہے کیونکہ اس صورت میں سرمایہ دار کو کم تنخواہ پر مزدور اور کاریگر مل سکتے ہیں۔ اس لئے وہ معاشی ناہمواری کو اس نظام کے لئے بے انتہا ضروری خیال کرتے ہیں، اور اس کے قائل ہیں کہ معاشرے میں اس کے بغیر کام نہیں ہو سکتا ہے۔

لیکن جمہوری اقدار اور روایات کا سب سے بڑا اثر یہ ہے کہ اس میں معاشی ناہمواری تو ہے مگر سماجی ناہمواری کے اثرات نہیں ہیں۔ فرد چاہے وہ کسان ہو، مزدور ہو، یا کاریگر اس کی عزت و احترام ہے اور اس کے بنیادی حقوق ہیں۔ قانون کی نظر میں سب برابر ہیں۔ قانون کی بالادستی نے امراء اور حکمران طبقوں کی مراعات اور حیثیت کو ختم کر دیا ہے۔ بدقسمتی سے پاکستان میں اب تک جمہوری روایات کی کمزوری کی وجہ سے قانون کی بالادستی نہیں ہے۔ اس لئے ہمارے ہاں جاگیردار اور دولت مند افراد خود کو قانون سے ماوراء سمجھتے ہوئے، اس کی خلاف ورزی کو بطور فخر لیتے ہیں۔

سماجی اور معاشی ناہمواری کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ معاشرے کی اکثریت عملی سیاست سے دور ہو جاتی ہے۔ معاشرے کے ذہین افراد جو کہ عوام سے تعلق رکھتے ہیں، انہیں آگے بڑھنے اور اپنی صلاحیتوں کے استعمال کا موقع نہیں ملتا ہے۔ دوسری جانب مراعات یافتہ طبقے محض اپنی طبقاتی

حیثیت کی وجہ سے حکومت کے اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے ہیں جب کہ ان کی صلاحیت اور ذہانت کا اس سے تعلق نہیں ہوتا ہے۔ جب معاشرہ قابل اور ذہین لوگوں سے محروم ہو جاتا ہے تو وہ پس ماندہ ہوتا چلا جاتا ہے۔ جیسا کہ پاکستان میں ہو رہا ہے۔ اعلیٰ طبقہ کے افراد نے عوام کے قابل افراد کی ترقی کے تمام راستے روک دیئے ہیں، جس کی وجہ سے ہمارے اداروں میں نا اہل لوگوں کی بھرمار ہے، جو ملک کو روز بروز پس ماندہ بنا رہے ہیں، لہٰذا جب تک سماجی اور معاشی ناہمواری کو ختم نہیں کیا جائے گا اور حکومت کے اداروں کو ذہین افراد کے لئے نہیں کھولا جائے گا، ہمارا ملک اور زیادہ پس ماندہ ہوتا چلا جائے گا۔

غیر ملکی تہذیب سے سیکھنا

تاریخ میں تہذیبیں ایک دوسرے سے سیکھتی ہیں۔ اکثر اوقات ترقی یافتہ ملک جب غیر ترقی یافتہ اور پس ماندہ ملک پر قبضہ کرتے ہیں تو اس کے نتیجہ میں اپنی تہذیب اور روایات کو فروغ دیتے ہیں اور شکست خوردہ ملک کو تہذیبی طور پر اپنا حصہ بنا لیتے ہیں۔ اس کا ایک مقصد تو سیاسی ہوتا ہے تا کہ ہاری ہوئی قوم نفسیاتی طور پر فاتح کلچر کے تحت ان کے تسلط کو تسلیم کرتے ہوئے ان کو اپنا محسن سمجھے کہ اس نے انہیں مہذب بنایا۔

ایک دوسری صورت میں ایک پس ماندہ قوم اپنے ترقی یافتہ ہمسایہ ملک سے سیکھتی ہے کہ اس نے کن وجوہات کی بنیاد پر ترقی کی، اور پھر کوشش کرتی ہے کہ اس علم کو حاصل کرے، اور اس کو بطور ماڈل استعمال کر کے ترقی کرے۔ اس علم کے اس حصول میں اسے یہ سہولت ہوتی ہے کہ یہ علم بنا بنایا اسے مل جاتا ہے اور اسے محض تقلید کرنی پڑتی ہے۔ مگر باشعور قومیں اس کا خیال رکھتی ہیں کہ تقلید کے اس عمل میں وہ اپنی تخلیقی صلاحیتیں نہ کھو دیں اور نہ اپنے کلچر کو مکمل ختم کر کے دوسری تہذیب میں خود کو اس طرح سے ڈھال لیں کہ ان کی اپنی شناخت ختم ہو جائے۔

اس سلسلہ میں ہمیں جاپان کی مثال ملتی ہے۔ کلاسیکل دور میں، جس کی ابتداء 500ء سے 1400ء تک ہے، اس دور میں جاپان ایک پس ماندہ ملک تھا کہ جس کی تہذیبی روایات پس ماندگی کی حالت میں تھیں جب کہ اس کا ہمسایہ ملک چین انتہائی ترقی یافتہ ملک تھا، جہاں علمی، فلسفیانہ، اور مذہبی نظریات و افکار کی شکلوں میں ابھر چکے تھے، ٹکنالوجی میں نئی نئی ایجاد ہو چکی تھیں، سیاسی طور پر ایک مضبوط مرکزی حکومت تھی، بنیادی طور پر چین کے معاشرے میں یہ تصور پختہ ہو چکا تھا کہ ان کے علاوہ دوسرے غیر مہذب اور وحشی ہیں۔ جاپان چین کی روایات سے متاثر ہوا، اور اس میں اس وقت اتنی توانائی نہیں تھی کہ اپنا علیحدہ کلچر پیدا کرتا اور نئے افکار کو جنم دیتا، یا نئی ایجادات کرتا، اس

لئے اس نے تقلید کے راستے کو اختیار کیا اور اس مقصد کے لئے جاپان کی حکومت نے تواتر کے ساتھ طالب علموں کو چین میں تعلیم کی غرض سے بھیجنا شروع کیا اس کے ساتھ تجارت کرنی شروع کی، اور ایک منظّم کوشش کی کہ چین سے علم کا حصول کر کے اپنے معاشرے کی تشکیل نو کرنی چاہئے۔

اس سلسلہ میں جاپان نے چینی زبان کے رسم الخط کو اختیار کر کے جاپانی زبان کی ترقی میں حصہ لیا، اگر چہ یہ رسم الخط جاپانی زبان کی پوری طرح سے ادائیگی نہیں کرتا تھا، لہٰذا انہوں نے اس میں ردو بدل کیا اور اس رسم الخط کو اختیار کیا۔ انہوں نے چینی طرزِ تعمیر کہ جس میں پگوڈا طرز کو استعمال کیا جاتا ہے اسے اپنی عمارتوں میں اختیار کیا، آرٹ میں چینی اسلوب کو لیتے ہوئے، اسے اپنے آرٹ میں ضم کیا۔ مارشل آرٹ یعنی جوڈو اور کراٹے، اور دوسرے فنون کو اختیار کرتے ہوئے انہیں جاپانی رنگ میں ڈھالا۔ کھانے کے آداب میں چین کے طور طریق پر عمل کرنا شروع کر دیا، فن زراعت میں زراعت کے نئے طریقوں اور باغبانی کو اپنے ہاں مقبول بنایا۔ مذہب میں کنفیوشس اور بدھ مت کو روشناس کرایا۔ چین کی سول سروس کی تقلید کرتے ہوئے اپنے ہاں بھی اسی نظام کو رواج دیا۔

جاپان کی تاریخ کا دوسرا اہم موڑ اس وقت آیا کہ جب 19 ویں صدی میں ایک امریکی بحری جہاز نے اس کی ایک بندرگاہ پر آ کر بمباری کی اور جاپان کی حکومت کو مجبور کیا کہ وہ اپنے دروازے تجارت کے لئے کھولے، اس مرحلہ پر جب یورپی تاجر اور سیاح جاپان آئے تو جاپان کے لوگوں کو ایک نیا تجربہ ہوا، اب تک وہ چینی تہذیب و کلچر میں رچے اور بسے ہوئے تھے، لیکن اس بار جو کلچر یہ غیر ملکی لے کر آئے یہ ان کے لئے بالکل نیا، انوکھا، اور دلچسپ تھا۔ انہوں نے اس کلچر سے فوراً ہی سیکھ کر، اور یہ اندازہ لگایا کہ جب تک ان کے سیاسی، سماجی، اور ثقافتی، روایات اور اداروں کو نہیں بدلا جائے گا وہ مغرب کے مقابلہ میں کمزور رہیں گے۔ اس سوچ کا ایک نتیجہ یہ ہوا کہ ان کے حکمران طبقوں نے سب سے پہلے سیاسی ڈھانچہ کو بدلا، اب تک جاپان میں شوگن طبقہ جو کہ بڑے فیوڈل اور جنگجو تھے ریاست پر ان کا قبضہ تھا، اب نئی تبدیلی یہ آئی کہ شوگن کے اقتدار کا خاتمہ کر کے فیوڈل نظام کو ختم کیا اور جاپان میں میجی خاندان کے بادشاہ کے اقتدار کو بحال کیا تاکہ ایک مضبوط مرکزی حکومت قائم ہو۔ فیوڈل ازم کے خاتمہ اور بادشاہت کے ادارے کی واپسی اور مرکز کی مضبوطی کے بعد معاشرے کے طبقاتی نظام کو کمزور کر کے تعلیم کو فروغ دیا تاکہ باصلاحیت

افراد تربیت کے بعد سامنے آئیں۔

اس مرحلہ پر جاپان کے دانشوروں میں اس مسئلہ پر بحث ہوئی کہ ملک کی ترقی کے لئے کون سے ماڈل کو اختیار کیا جائے۔ کیا جاپان کی قدیم روایات اور اداروں کا احیاء کیا جائے، یا مغرب کی تہذیب سے سیکھا جائے؟ اس مباحثہ میں ان دانشوروں کو کامیابی ہوئی کہ جو یہ سمجھتے تھے کہ ان کا قدیم نظام موجودہ حالات میں ناکارہ اور بیکار ہو گیا ہے۔ اس میں اتنی توانائی اور جان نہیں ہے کہ وہ موجودہ چیلنجوں کا مقابلہ کر سکے۔ اس لئے وہ اس حق میں تھے کہ مغرب کی روایات اور اداروں کو اختیار کر کے ترقی کی جانب جایا جائے۔ اس مقصد کی خاطر دانشوروں، طالب علموں اور تاجروں نے یورپ اور امریکہ کے دورے کئے، ان کے نظام کو سمجھا، اور پھر ان کے بارے میں اپنے مقالات و مضامین سے جاپان کے لوگوں کو آگاہ کیا تا کہ ان کی ذہنی تربیت ہو۔ لہٰذا اس عمل کے نتیجہ میں ایک تو بنیادی تعلیم کو اولیت دی گئی۔ اس کے بعد جمہوری روایات اور اداروں کو قائم کیا گیا، یونیورسٹیوں کو جرمن ماڈل پر تشکیل دیا گیا اور صنعت و حرفت کی طرف توجہ دی گئی۔ اگرچہ اس عمل میں انہیں مشکلات کا سامنا کرنا پڑا، کیونکہ مغرب کے صنعت کاروں نے جاپان کے سیاحوں اور صنعتی ماہرین پر اپنی فیکٹریوں کے دروازے بند کر دیئے تھے، کیونکہ وہ نہیں چاہتے تھے کہ ان کی صنعت کے راز جاپان تک پہنچیں، لیکن اس کے باوجود جاپان نے صنعتی میدان میں ترقی کی۔

مغرب کے اس ماڈل کو اختیار کر کے جاپان نے بہت کم وقت میں صنعتی اور معاشی ترقی تو کی، مگر اس کے ساتھ ہی اس میں مغربی امپیریل ازم کی طرح جاپانی امپیریل ازم کے جذبات بھی پیدا ہوئے، اپنے مال کے لئے منڈیاں تلاش کی جائیں، وہاں سے خام مال لایا جائے، لہٰذا تاریخ میں پہلی مرتبہ جاپان نے امپیریل ازم کی پالیسی کو اختیار کرتے ہوئے اپنے ہمسایہ ملکوں پر تسلط جمانا شروع کیا۔ اس مرحلہ پر چین، مغربی طاقتوں کے ہاتھوں شکست کھا کر بے انتہا کمزور ہو چکا تھا، اس لئے جب جاپان نے چین پر حملہ کر کے اسے شکست دی اور منچوریا پر قبضہ کر لیا تو چین کو اس پر اس قدر حیرانی اور صدمہ ہوا کہ اس کو اپنی شکست کا یقین نہیں آتا تھا، کہ اسے اس ملک کے ہاتھوں شکست ہوئی کہ جو اس کی تہذیب کے زیر نگیں تھا۔

جاپان کی فوجی قوت کا یورپ کو اس وقت پتہ چلا کہ جب اس نے 1905ء میں روس کو ایک بحری جنگ میں شکست دی۔ یہ ایشیاء کے ایک ملک کی یورپ کے بڑے ملک کو شکست دینا ایک

اہم واقعہ تھا، اس نے نو آبادیاتی ملکوں میں اپنی آزادی کے خلاف جدوجہد میں ایک نیا حوصلہ دیا۔

پہلی جنگ عظیم کے بعد جاپان کی توسیع پسندی کے عزائم بہت بڑھ گئے تھے اس کی پالیسی تھی کہ چین اور جنوب مشرقی علاقے پر وہ اپنا تسلط قائم کرے، اس لئے دوسری جنگ عظیم میں اس نے جرمنی کا ساتھ دیا۔ مگر اس شکست نے اس کے تمام منصوبوں کو خاک میں ملا دیا۔ بلکہ اس کے نتیجہ میں ہیروشیما ناگاسا کی پر ایٹم بم کے حملوں نے ان دوشہروں اور ان کی آبادی کا خاتمہ کر دیا۔ یہ ایک ایسی شکست تھی کہ جس نے جاپان کی تمام ترقی اور حوصلوں کو وقتی طور پر روک دیا۔

جنگ کے بعد جاپان کا جو نیا دستور بنا، اس میں ایک تو شہنشاہ کی طاقت واختیارات کا خاتمہ کر کے اسے برائے نام بادشاہ بنا دیا، دوسرا جاپان نے جنگ کو ہمیشہ کے لئے خیر آباد کہہ دیا، اور اپنی تمام توانائی اور صلاحیت کو اپنی صنعتی، معاشی اور سیاسی وسماجی ترقی پر لگایا، اور بہت جلد شکست کی تباہ کاریوں سے نکل کر دوبارہ سے خود کو سنبھال لیا۔

جاپان کی اس مثال سے یہ بات واضح ہو کر ہمارے سامنے آتی ہے کہ کسی دوسری تہذیب کی تقلید کرنا، اس سے علم حاصل کرنا، اس کی ایجادات اور ٹکنالوجی سے فائدہ اٹھانا اور اس کے کلچر کو اختیار کرنا ترقی کی جانب ایک قدم ضروری ہوتا ہے۔ لیکن اگر قومیں محض تقلید کرتی رہیں، اور اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو استعمال نہ کریں تو وہ ایک مرحلہ پر آ کر رک جاتی ہیں۔ تقلید کے بعد تحقیق کا ہونا لازمی ہوتا ہے، جو قوم میں اپنی شناخت کو پیدا کر کے، اعتماد کے جذبات ابھارتا ہے۔

پہلے مرحلہ میں جب جاپان نے چین کی تقلید کی تو وہ اس کے کلچر اور روایات میں قید رہا، اور اس نے نہ تو اس میں کچھ اضافہ کیا اور نہ ہی اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو ابھارا۔ اس لئے وہ ایک جگہ آ کر ٹھہر گیا۔ مگر دوسرے مرحلے میں جب اس نے مغرب کو ماڈل بنا کر اس کی روایات کو اختیار کیا تو اس نے ایک مرحلہ کے بعد اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو استعمال کیا۔ اپنی کلچر روایات کو بھی برقرار رکھا اور سائنس، ٹکنالوجی اور صنعت میں اضافے کر کے اپنی حیثیت کو تسلیم کرایا۔ اس وجہ سے جاپان میں احساس کمتری پیدا نہیں ہوا، اور اس میں اعتماد کے جذبات ابھرے، جو قومی فخر کا باعث بنے۔ اس وقت جاپان زندگی کے ہر شعبہ میں ترقی کر رہا ہے اور مغرب کے مقابلہ میں اپنی حیثیت کو تسلیم کرا رکھا ہے۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پاکستان اس سے کیا سبق سیکھ سکتا ہے؟ کیا اسے مغربی تہذیب

کو اختیار کرتے ہوئے ابتدائی طور پر اپنی روایات اور اداروں کو تبدیل کرنا ہوگا۔ اس کے لئے ضروری ہوگا کہ جاگیرداری اور قبائلی سرداری کا خاتمہ ہو، بنیادی تعلیم کو فروغ دیا جائے۔ معاشرے سے مراعات یافتہ طبقے کی بالادستی کا خاتمہ کر کے معاشرے کے ہر فرد کو اس کی ذہانت اور صلاحیت کے مطابق مواقع دیئے جائیں۔

پاکستان کے کچھ دانشوروں کا یہ نظریہ کہ بیرونی کلچر کی یلغار ہمارے لئے خطرناک ہے، ایک فرسودہ خیال ہے۔ ہمیں اپنی ان روایات اور اداروں کا خاتمہ کرنا ہوگا جن کی افادیت ختم ہو چکی ہے، اور دوسری قوموں کے تجربات اور علم سے سیکھنا ہوگا تاکہ اس کی مدد سے ہم خود اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو پیدا کر سکیں۔ لہٰذا یہ سوچنا ہوگا کہ کیا ہم اپنی شکستہ خوردہ کلچر کو باقی رکھ کر پس ماندگی قبول کریں گے اور اسی طرح ذلت وخواری میں رہیں گے یا جدید تہذیب کو اختیار کر کے ترقی کی راہ کو اختیار کریں گے؟

معاشی ناہمواری

چین کے حکمران اپنے فلسفیوں کی عزت اور احترام کرتے تھے، اور اکثر سلطنت کے امور میں ان سے مشورے لیا کرتے تھے۔ ایک مرتبہ ایک ریاست کے حکمران نے فلسفی سے پوچھا کہ آپ مجھے مشورہ دیں کہ میں کیا کروں، کیونکہ میری سلطنت میں بہت چور اور ڈاکو ہو گئے ہیں، جن کی چوری اور ڈاکہ زنی کی وجہ سے ملک میں بدامنی، انتشار اور عدم تحفظ ہے۔ فلسفی نے اس کی بات کو غور سے سنا اور کہنے لگا کہ ''تم خود چوری کرنا بند کر دو، اس کا اثر تمہارے ملک کے چوروں اور ڈاکوؤں پر ہوگا۔''

چینی فلسفی کی یہ بات آج ہمارے ملک اور ہمارے حکمران طبقوں پر پوری طرح صادق آتی ہے۔ حکمران اور حکمران طبقے جن کے فرائض میں عوام کا تحفظ ہے، اور جو اس بات کے ذمہ دار ہیں کہ لوگوں کے مسائل حل کریں گے اور ان کی معاشی بدحالی کو دور کریں گے، وہی طبقے جب رشوت، اور بدعنوانیوں میں مبتلا ہو جائیں اور عوام کے ذرائع کو لوٹنے میں مصروف ہو جائیں، تو اس صورت میں چوری اور ڈاکہ زنی کو کیسے ختم کیا جا سکتا ہے؟ جب معاشرے میں معاشی ناہمواری ہو، امیر و غریب کا فرق ہو، تو اس کے ساتھ ہی دونوں طبقوں کے آپس کے تعلقات میں فرق آ جاتا ہے۔

جب معاشرے کی اکثریت محنت و مشقت کے باوجود غربت اور افلاس کی زندگی گذارنے پر مجبور ہو تو اس کے نتیجہ میں ملک بدامنی اور بے یقینی کا شکار ہو جاتا ہے۔

جاگیردارانہ معاشرے میں، معاشی ناہمواری کو ختم کرنے کا طریقہ صدقہ، خیرات تھا، اس تناظر میں مخیّر حضرات کا گروہ پیدا ہوتا تھا، جو اپنے لوٹے ہوئے مال سے ایک حصہ بطور خیرات نکال کر عوام کی نظروں میں فیاض و سخی بن جاتے تھے۔

یہ لوگ بھوکے، مفلس اور لاچار لوگوں کے لئے لنگر کا انتظام بھی کرتے تھے کہ جہاں سے

غریب لوگوں کو کھانا مل جاتا تھا اور یہ غربت زدہ لوگ کھانے کے انتظار میں قطاروں میں کھڑے فیاض وسخی فرد کو دعائیں دیتے رہتے تھے۔ لیکن خیرات، اور لنگر سے معاشرے کی غربت ختم نہیں ہوئی، اور یہ سلسلہ آج بھی جاری ہے کہ جہاں ہوٹلوں سے باہر قطاروں میں کھڑے لوگ کسی مخیّر حضرت کی فیاضی کی امید میں کھانے کا انتظار کرتے ہیں۔ چونکہ ہمارا معاشرہ اب تک جاگیردارانہ کلچر کا شکار ہے، اس لئے اس میں یہ روایات پوری طرح سے جاری ہیں۔

معاشی ناہمواری کی دوسری مثال، سرمایہ دارانہ نظام ہے جو صنعتی انقلاب کے بعد پوری شدومد سے آیا۔ اس نے معاشرے میں ناہمواری کو مستحکم کیا، کیونکہ سرمایہ دار اور صنعت کار کو سستی مزدوری چاہئے تھی، اور یہ اسی وقت مل سکتی تھی جب کہ زیادہ سے زیادہ معاشی ناہمواری ہو، اور مزدور کم سے کم اجرت پر کام کرنے پر مجبور ہوں۔

انگلستان کے معاشی مفکر ریکارڈو نے کم اجرت کے بارے میں جو نظریہ دیا وہ "تنخواہ کا آہنی قانون" (Iron Rule of Wages) کہلاتا ہے۔ اس نظریہ کے مطابق کارخانوں میں کام کرنے والے مزدوروں کو اتنی اجرت دینی چاہئے کہ جس میں وہ گذارا کر سکیں، اگر انہیں زیادہ اجرت دی گئی تو وہ زیادہ بچے پیدا کریں گے اور ملک میں آبادی کو بڑھائیں گے، یا شراب نوشی میں اپنا پیسہ برباد کر دیں گے۔ ریکارڈو کے اس نظریہ کو یورپ اور امریکہ کے سرمایہ دار طبقے میں بڑی قبولیت ملی کیونکہ یہ ان کے مفاد میں تھا۔

امریکہ کا سرمایہ دار کارنیگی جو اسکاٹ لینڈ کے ایک مزدور کا بیٹا تھا، اور جس نے امریکہ میں جا کر دولت کمائی اور فولاد کے کارخانوں کا سب سے بڑا سرمایہ دار بن گیا، وہ معاشرے میں ناہمواری کا قائل تھا، کیونکہ اس ناہمواری کی وجہ سے مزدور محنت ومشقت کے ساتھ زیادہ اجرت کے لئے کام کرتے ہیں اور معاشرے کی ترقی میں حصہ لیتے ہیں۔ لیکن وہ اس کا بھی قائل تھا کہ جو دولت کمائی جائے، اس میں معاشرے کے لوگوں کو شریک کیا جائے مگر وہ خیرات یا لنگر کا مخالف تھا، اس کے بجائے اس نے امریکہ کے ہر شہر میں کتب خانے قائم کئے اور تحقیق کے لئے کارنیگی فاؤنڈیشن قائم کی، جو اب تک موجود ہے۔ امریکہ کے دوسرے بڑے سرمایہ داروں نے بھی اپنی دولت کو یونیورسٹیوں کے قیام، آرٹ گیلریز، میوزیم، اور موسیقی کے لئے وقف کیا، اور تحقیقی ادارے قائم کئے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ معاشرے میں علم کا پھیلاؤ ہوا، لوگوں میں سیاسی اور سماجی

شعور آیا، اوراس کے نتیجہ میں جمہوری ادارے مضبوط ہوئے، ریاست کے ان اداروں کی مدد سے لوگوں کے مسائل کو حل کیا گیا۔

معاشی ناہمواری کو ختم کرنے کا ایک اور تجربہ روبرٹ اون (Robert Owen) نے کیا۔ یہ سوشلسٹ خیالات کا حامی تھا، اور اس کا نظریہ تھا کہ اگر معاشی ناہمواری کا خاتمہ ہو جائے، مزدوروں کو خوشگوار ماحول اور اچھی تنخواہ ملے تو اس صورت میں وہ زیادہ محنت، مشقت اور دلچسپی کے ساتھ کام کریں گے۔ اپنے نظریات کو عملی جامہ پہناتے ہوئے اس نے ایک ماڈل فیکٹری قائم کی۔ جس میں مزدوری کے اوقات کم تھے۔ مزدوروں کی رہائش فیکٹری میں بھی، بچوں کے لئے اسکول اور کھیل کے میدان تھے۔ فیکٹری میں کوآپریٹو اسٹور تھے کہ جہاں سے سستے نرخ پر اشیاء خریدی جاسکتی تھیں۔ اس کے اس ماڈل کارخانے کا اثر اچھا ہوا، مزدوروں نے فیکٹری کی پیداوار میں اضافہ کیا، اور اچھے ماحول میں مزدوروں کو تفریح، اور زندگی سے لطف اٹھانے کے مواقع ملے۔ انہوں نے اپنی اس ماڈل فیکٹری کے لئے برطانوی پارلیمنٹ کے اراکین سے درخواست کی کہ وہ اس ماڈل کو ملک میں مقبول بنانے میں حصہ لیں، مگر پارلیمنٹ کے ارکان اور دوسرے سرمایہ داروں نے اس کی مخالفت کی اور بالاخر اس کا یہ تجربہ ناکام ہوا۔ اس نے ایک اور کوشش امریکہ میں جا کر کی کہ جہاں اس قسم کے تجربات کے لئے امریکہ مشہور تھا، مگر وہاں بھی وہ ناکام رہا۔

اس کی ناکامی کی وجہ یہ تھی کہ علیحدگی میں رہتے ہوئے، اور ریاست کے ادارہ کو تبدیل کئے بغیر، اس قسم کے تجربات کامیاب نہیں ہو سکتے ہیں۔ اسی وجہ سے کارل مارکس نے اس کو یوٹوپیائی یا تصوراتی سوشلسٹ کہا۔ سماج میں تبدیلی اس وقت آتی ہے کہ جب نظام کو بنیادی طور پر بدلا جاتا ہے۔

اس وجہ سے جاگیردارانہ اور صنعتی نظام میں معاشی ناہمواری کی یہ کوششیں ناکام ہو گئیں لیکن مغرب میں اور امریکہ میں جب ریاست کا ادارہ جمہوری ہوا، اور حکمران لوگوں کے ووٹوں سے اقتدار میں آنے لگے تو پھر وہ مجبور ہوئے کہ اگر معاشی ناہمواری کو مکمل طور پر ختم نہ کریں تو کم از کم اس میں کمی ضرور کی جائے، اور سماجی ناہمواری کے خاتمہ کے بعد معاشی ناہمواری کے زخموں کو مندمل کر دیا جائے۔ اس وجہ سے ان ملکوں میں اگرچہ امیر وغریب کا فرق موجود ہے، مگر ریاست اس پر مجبور ہے کہ وہ سوشل سیکورٹی کے ذریعہ غربت کے مسائل کو حل کرے۔

اس تناظر میں جب ہم پاکستان کی صورت حال کو دیکھتے ہیں، تو ہم اس معاشرے میں جاگیردارنہ کلچر اور صنعتی رویئے دونوں کو پاتے ہیں۔ جیسا کہ اس مضمون کے شروع میں چینی فلسفی نے حکمران سے کہا تھا کہ وہ خود چوری بند کرے چوری نہ کرے، اگر اس کو ہم پاکستان پر حکمران طبقوں میں لاگو کرتے ہیں تو دیکھتے ہیں کہ یہ لوگ بنکوں سے قرض لے کر اسے معاف کرا لیتے ہیں۔

یہ لوگ نہ تو حکومت کو کوئی ٹیکس دیتے ہیں اور نہ ہی بجلی اور گیس کے بل ادا کرتے ہیں۔ فوج اور بیوروکریسی کے اعلیٰ افسران اس قدر مراعات لیتے ہیں کہ جس کا اندازہ کرنا مشکل ہے۔ اب تو سابق وزراء، وزیراعظم اور صدر کو تاحیات پنشن کے نام پر بڑی رقم دی جاتی ہے۔ جب حکومت کے لوگ اس لوٹ کھسوٹ میں ملوث ہوں گے تو خزانہ تو خالی ہوگا، اور ملک چلانے کے لئے قرضے لینا پڑیں گے۔

دوسری طرف حکمران طبقوں کی بدعنوانیوں سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ملک میں کہیں قبضہ گروپس ہیں تو کہیں ڈاکوؤں اور چوروں کے گروہ جو عام آدمی کے گھر سے لے کر بنکوں کو لوٹنے میں مصروف ہیں۔

امریکہ میں کہا جاتا ہے کہ اگر کوئی فرد سرمایہ دار اور دولت مند نہیں بن پاتا تو یہ اس کا قصور ہے، ورنہ اس کے لئے مواقع موجود ہیں۔ لہٰذا یہی صورت حال پاکستان میں ہے کہ اگر کوئی بدعنوانیوں میں ملوث ہوکر دولت اکٹھی نہیں کر پاتا تو یہ اس کا قصور ہے، ورنہ ملک میں اس مقصد کے لئے کھلے مواقع ہیں۔

لیکن ظاہر کہ اکثریت میں یہ اہلیت نہیں ہوتی ہے، اور اس صورت میں وہ غربت، مفلسی اور عسرت کا شکار ہوکر اپنی تمام توانائی کھو دیتی ہے۔ معاشی ناہمواری کی وجہ سے ملک کی ترقی پر اثر پڑتا ہے۔ اکثریت اس ناہمواری کے بوجھ کو اٹھائے پوری زندگی محنت و مشقت میں صرف کر دیتی ہے اور ان کی تخلیقی صلاحیتیں اس چکر میں ضائع ہو جاتی ہیں۔

جدید کیسے بنا جا سکتا ہے؟

اس سوال کا جواب کہ کسی ملک یا معاشرے کو کس طرح سے جدید بنایا جائے، تو اس کے جواب میں جو نظریات دیئے جاتے ہیں وہ یہ ہیں کہ ملک میں صنعتی عمل ہو، جس کے نتیجہ میں پیداواری عمل میں اضافہ ہوگا اور ایک روشن خیال بورژوا طبقہ وجود میں آئے گا جو ملک کی ترقی میں حصہ لے گا، جب ترقی کا عمل آگے بڑھے گا تو وہ تمام ادارے اور روایات جو اس کی راہ میں حائل ہیں وہ آہستہ آہستہ دم توڑ دیں گے اور اس طرح سے ایک نئے دور کا آغاز ہو جائے گا۔

جدیدیت اور ترقی کا یہ نظریہ اپنی جگہ درست ہے اور بہت سے ملکوں میں جدیدیت کو اسی راستے سے اختیار کیا گیا ہے۔ مگر پاکستان کے حالات کو دیکھتے ہوئے ہمیں ایک اور راہ کو تلاش کرنا ہے کہ جس کی بنیاد پر جدیدیت کی ابتداء کی جا سکے۔ لیکن اس راہ کے تعین میں حکمران طبقوں اور ریاست کی شمولیت انتہائی ضروری ہے۔ جدیدیت کے لئے سب سے اہم سفر تعلیم کا ہے۔ ملک میں وسیع پیمانہ پر تعلیم کو عام کیا جائے۔ لیکن یہاں یہ ضروری ہے کہ تعلیم کا مقصد صرف یہ نہیں ہوتا ہے کہ لوگ لکھنا اور پڑھنا سیکھ جائیں، بلکہ تعلیم کا مقصد ذہنی تربیت ہوتا ہے، ایسی تربیت کہ جو لوگوں میں سیاسی، سماجی، اور ثقافتی شعور کو پیدا کرے۔ اس وجہ سے سکول کے طلباء کو ابتداء میں دنیا میں ابھرنے والی اور ارتقاء کرنے والی تہذیبوں کے بارے میں پڑھایا جائے، کیونکہ تہذیبوں کی تاریخ سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ عقائد کی ابتداء کیسے ہوئی، انسانی ذہن کس طرح تخلیقی مراحل سے گذرا اور وقت کی ضرورت کے مطابق ایجادات کیں، اور یہ کہ زمانہ کبھی ایک جگہ ٹھہرا ہوا نہیں رہا، بلکہ برابر تبدیل ہوتا رہا ہے۔ تبدیلی انسان اور انسان سماج میں موجود ہے، اس لئے قدامت پرستی کو سچائی اور عقیدے کے طور پر تسلیم نہیں کرنا چاہیئے، بلکہ روایات، رسم و رواج، اور اداروں میں تبدیلی کے عنصر کو قبول کرنا چاہیئے۔ اس کے برعکس اگر تعلیم کو نظریاتی حدود میں پابند کر دیا جائے تو

پھر اس کے نتیجہ میں معاشرے میں تنگ نظری اور مذہبی بنیاد پرستی پیدا ہو گی۔ جیسا کہ اس وقت ہماری نصابی کتابوں کے ذریعہ ذہنوں کو کھولنے کے بجائے بند کیا جا رہا ہے۔

دوسرا اہم مسئلہ صحت کا ہے۔ صحت کے حصول کے لئے ضروری ہے کہ لوگوں کو صفائی کے بارے میں بتایا جائے، اور یہ بتایا جائے کہ ہاجن کے ذریعہ فرد کئی بیماریوں سے محفوظ رہ سکتا ہے۔ صفائی کے لئے ریاست اور لوگوں، دونوں میں شعور کا ہونا ضروری ہے۔ کوڑا اور کچرا اٹھانا، گندے پانی کی نکاسی، سڑکوں اور گلیوں کی صفائی، تعلیم کے ذریعہ لوگوں کو صحت کے بنیادی اصولوں کے بارے میں بتایا جا سکتا ہے۔

جہاں تک صفائی کا تعلق ہے، برصغیر ہندوستان میں اکثریت صفائی اور ہاجن کے اصولوں کی پرواہ نہیں کرتے ہیں۔ بقول ایک دوست کہ مغرب، مشرق وسطیٰ اور جنوب مشرق کے ملکوں میں سیاحت کر کے اور ان کی صفائی ستھرائی کے بعد جیسے ہی برصغیر ہندوستان میں آتے ہیں، جس میں پاکستان اور بنگلہ دیش بھی شامل ہیں، تو یہاں گندگی اور غلاظت کے ڈھیر نظر آتے ہیں۔

اس مسئلہ پر کہ آخر برصغیر میں صفائی کے بارے میں ہمارے یہ رویئے کیوں ہیں؟ تو ہمارے دوست پرویز وندل کا کہنا ہے کہ چونکہ یہاں صفائی کا کام ایک خاص ذات سے ہے، اس لئے دوسری ذات کے لوگ صفائی نہیں کرتے ہیں، اور اس کام کو اپنی ذات کے خلاف سمجھتے ہیں۔ اس صفائی اور صحت کا تعلق بھی تعلیم و تربیت سے ہے۔ اگر میڈیا سیاسی ٹاک شوز کے بجائے، اس مسئلہ پر لوگوں کی توجہ مبذول کرائے تو وہ تبدیلی کے عمل میں حصہ لے سکیں گے۔ تعلیم یافتہ اور صحت مند قوم ہی ترقی کو اختیار کر سکتی ہے۔ جہاں اکثریت میں جہالت ہو، اور بیماریوں اور کم غذا کی وجہ سے کمزور و نحیف ہوں، وہ قوم قطعی نہ تو جدید بن سکتی ہے اور نہ ترقی کر سکتی ہے۔

شہروں میں پبلک ٹرانسپورٹ کی جو حالت ہے، اس کی وجہ سے عام لوگوں کو بسوں اور ویگنوں میں جانوروں کی طرح بھر کر سفر کرنا پڑتا ہے۔ روز کی اس تکلیف سے عورتیں، بچے اور مرد ذہنی اور جسمانی طور پر اس قدر تھک جاتے ہیں کہ ان میں کچھ اور کام کرنے کی توانائی باقی نہیں رہتی ہے۔ جدید ریاستوں میں پبلک ٹرانسپورٹ پر خاص توجہ دی گئی ہے کہ جس میں سفر کرتے ہوئے مسافر موسیقی سنتے ہیں، اخبار اور کتابیں پڑھتے ہیں، یا آرام کرتے ہیں اور تازہ دم رہتے ہیں، جس کی وجہ سے آفس اور گھر دونوں جگہ پر خوش و خرم رہتے ہیں۔

چونکہ ہمارے ملک میں پبلک ٹرانسپورٹ کی طرف توجہ نہیں دی گئی ہے، اس لئے ہر فرد کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ اپنی سواری کا انتظام کرے۔ اس کے نتیجہ میں سڑکوں اور شاہراہوں پر ٹریفک بڑھ گیا ہے اور فضائی آلودگی میں اضافہ ہوگیا ہے۔

جدیدیت کا تعلق سماجی رویوں سے ہے۔ مثلاً ہمارے ہاں لوگ قطار میں کھڑا ہونا پسند نہیں کرتے کیونکہ قطار میں کھڑے ہونے کا مطلب ہے کہ یہاں اعلیٰ اور ادنیٰ سب ایک صف میں کھڑے ہو گئے۔ اس کا اندازہ اس وقت ہوتا ہے کہ جب لوگ بیرونی ممالک سے پاکستان آتے ہیں اور بااثر حضرات کی سفارش کی وجہ سے انہیں قطار سے نکال کر سب سے پہلے ان کا امیگریشن کرالیا جاتا ہے۔ دوسری جگہ کہ جہاں قطار کی ضرورت ہوتی ہے، وہاں ان کے ملازم لائن میں کھڑے ہوتے ہیں۔ یہاں بھی جو لوگ جسمانی طور پر طاقتور ہوتے ہیں وہ کمزوروں کو دھکیل کر خود آگے بڑھ جاتے ہیں۔

سماجی رویہ کا ایک اظہار کھانے کی دعوتوں میں ہوتا ہے کہ جہاں لوگ بغیر کسی ادب آداب کے کھانے پر ٹوٹ پڑتے ہیں۔

ایک جدید معاشرے کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ اس میں فرد چاہے اس کا تعلق کسی ذات، برادری یا پیشہ سے ہو، اس کی عزت و احترام کیا جائے، لیکن ہمارے طبقاتی اور افسرانہ معاشرے میں یہ نہیں ہے، یہاں امیر و غریب، افضل و کم تر، اونچی ذات اور ادنیٰ ذات کے درمیان فرق اور امتیاز برقرار رکھا جاتا ہے اور اپنے سے کم تر لوگوں کو ان کی حیثیت سے بار بار آگاہ کیا جاتا ہے۔

کلچرل رویوں میں، جدیدیت کے لئے، ایک اہم رویہ وقت کی پابندی ہے، اگر روزمرہ کے معمولات میں وقت کی پابندی نہیں کی جائے، تو نہ صرف انفرادی زندگی، بلکہ معاشرہ بحیثیت مجموعی انتشار کا شکار ہو جاتا ہے۔ جب کام وقت پر نہ ہو، تو اس کے اثرات زندگی کے ہر شعبہ پر ہوتے ہیں۔

اس لئے جو ملک جدید بنے انہوں نے ابتدائی طور پر معاشرے کی ان بنیادی ضرورتوں کو پورا کیا۔ اس کی ایک مثال تو جاپان کا میجی انقلاب ہے، جس میں حکمران طبقوں کی جانب سے پہلا قدم یہ اٹھایا گیا کہ جاگیرداری کو ختم کر کے تعلیم اور صحت کے شعبوں میں اصلاحات کی گئیں۔ جب تعلیم یافتہ اور صحت مند افراد تیار ہوئے تو صنعتی عمل شروع ہوا، اور جاپان نے سیاسی نظام میں

جمہوری اداروں اور روایات کو بادشاہت کے ماتحت قائم کیا۔

اس کی دوسری مثال کوریا کی ہے کہ جس کے پارک جو کہ ایک فوجی ڈکٹیٹر تھا نے، جس کا تعلق ایک غریب گھرانہ سے تھا، جب اس نے فوجی آمریت قائم کی، تو سب سے پہلے جاگیرداری ادارے کو ختم کیا اور معاشرے میں سب کے لئے تعلیم کو لازم کر کے، ان کی تربیت کی، اس کے بعد ملک میں صنعتی ترقی بھی ہوئی اور جمہوریت بھی آئی۔

یہی صورت حال چین کی تھی کہ جہاں سوشل ازم کے آنے کے بعد تعلیم اور صحت سے ایک تربیت یافتہ نوجوان نسل کو تیار کیا جس نے صنعتی عمل میں حصہ لے کر چین کی ترقی کو تیز رفتاری میں تبدیل کر دیا۔

اس کے مقابلہ میں ہندوستان میں صنعتی عمل اور جمہوریت تو آ گئی، مگر تعلیم، صحت اور ثقافتی رویوں کے نہ بدلنے کی وجہ سے وہاں معاشرہ اب تک پس ماندہ ہے، ذات پات کی تقسیم، غربت اور مفلسی، اور جہالت نے ترقی کو صرف اوپر کی سطح پر محدود کر کے رکھ دیا ہے۔

اس صورت حال کی روشنی میں جب ہم پاکستان کے معاشرے اور اس کے مسائل کو دیکھتے ہیں، تو ہمارے سامنے یہ تاریک تصویر آتی ہے کہ جاگیردارانہ اور قبائلی نظام نے تعلیم کے راستوں کو روک رکھا ہے، حکمران طبقے تعلیم کا مقصد نظریاتی سمجھتے ہیں اور اس کے ذریعہ اپنے مفادات کا تحفظ چاہتے ہیں، اس لئے یہ تعلیم نوجوانوں کے ذہن کو پس ماندہ بنائے ہوئے ہے، اور روشن خیالی و رواداری کی جگہ بنیاد پرستی اور تعصّبات نے جڑیں پکڑ لی ہیں۔ اس لئے یہ تعلیم ترقی کے بجائے اور زیادہ پس ماندہ بنائے ہوئے ہے۔

جاگیرداری کے خاتمہ اور تعلیم کے فروغ کے لئے حکمران طبقوں کی دلچسپی لازمی ہے جو قوانین کے ذریعہ ان دونوں شعبوں میں اصلاحات کریں۔ اگر معاشرے میں یہ بنیادی سہولتیں مہیا نہیں کی گئیں تو اس صورت میں نہ تو صنعتی عمل اور نہ ہی جمہوریت پاکستان کو جدید بنا سکیں گی۔

سب کوخوش رکھنا

علی گڑھ یونیورسٹی کے ایک سابق وائس چانسلر پروفیسر خسرو کے بارے میں ایک واقعہ بیان کیا جاتا ہے کہ جب وہ وائس چانسلر تھے، طالب علموں کے دوگروہوں میں جھگڑا ہوا۔ شام کو جب وہ اپنی بیگم کے ہمراہ ڈرائنگ روم میں بیٹھے تھے کہ طلباء کی ایک جماعت کے لوگ ان سے ملنے آئے اوران کے سامنے اپنا موقف بیان کیا۔ اسے سن کر پروفیسر صاحب نے کہا کہ آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں، اور آپ اپنی جگہ بالکل صحیح ہیں۔ ان کے جانے کے بعد طلباء کا دوسرا گروہ آیا اوراس نے پہلے والوں سے مختلف اپنا موقف پیش کیا۔ اسے سن کر پروفیسر صاحب نے کہا کہ آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں اور آپ اپنی جگہ بالکل درست ہیں۔ ان دونوں گروہوں کے جانے کے بعد، بیگم صاحبہ جو یہ سب کچھ دیکھ رہی تھیں، انہوں نے حیرانی سے پوچھا کہ آپ نے دونوں کو کیسے یہ کہہ دیا کہ وہ دونوں ٹھیک ہیں۔ اس پر پروفیسر صاحب نے کہا، آپ بھی اپنی جگہ بالکل ٹھیک ہیں۔

جن لوگوں کو سب کو خوش کرنے، یا رکھنے کا فن آتا ہے، کہا جاتا ہے کہ وہ ایک کامیاب زندگی گذارتے ہیں۔ ان کے مخالفوں یا تنقید نگاروں کی تعداد کم ہوتی ہے اور وہ سب کو خوش رکھ کر ترقی کی منزلیں آسانی کے ساتھ طے کرتے چلے جاتے ہیں۔

ہمارے معاشرے میں بھی اس فن کے ماہرین موجود ہیں، بلکہ دولوگوں کی اکثریت اس بات پر متفق ہے کہ کیوں کسی پر بلاوجہ تنقید کی جائے اور اسے اپنا مخالف بنایا جائے۔ اگر کوئی آپ کی خوشامد سے خوش ہو جاتا ہے تو اس میں کیا ہرج ہے۔ اس رویہ کا اظہار ویسے تو ہمارے ہاں ہر طبقہ میں موجود ہے، مگر خاص طور سے ہمارے دانشوروں میں اس کا عام رواج ہے، جس کا مظاہرہ ہم کتابوں کی رونمائی اور اجراء کے موقعوں پر دیکھتے ہیں۔ ویسے تو مصنف کی کوشش ہوتی ہے کہ مقررین میں ان کو دعوت دے جو اس کی تعریف کریں، ویسے بھی عام دستور اب یہ ہے کہ کتاب

کے بارے میں تعریف وتوصیف کے بیانات دیئے جائیں، اور مصنف کی تخلیقی صلاحیتوں کی داد دی جائے۔ اکثر ایسا بھی ہوا ہے کہ بعض مقررین نے برسرِجلسہ اس کا اعتراف بھی کرلیا کہ انہوں نے کتاب نہیں پڑھی ہے، مگر چونکہ وہ مصنف سے واقف ہیں، اس لئے کہہ سکتے ہیں کہ اس کی کتاب ادب کی تاریخ میں اضافہ ہوگی۔ اکثر ایسا بھی ہوتا ہے کہ مقرر کتاب پر قطعی نہیں بولتے ہیں، بلکہ اپنی تقریر کر کے سامعین پر اپنے علم کی دھاک بٹھا دیتے ہیں۔

یہی حال کتابوں کے ریویو کا ہوتا ہے۔ ہاں اگر کسی سے دشمنی ہے تو پھر ریویو میں اس کا بدلہ لے لیا جاتا ہے۔ مگر ایسا کم ہی ہوتا ہے۔ کتابوں کے فلیپ پر تعریف میں لکھوانا بھی عام روایت ہوگئی ہے۔ بلکہ بعض اوقات بڑے مصنّفین تو یہاں تک کہہ دیتے ہیں کہ آپ لکھ لائیے، میں اس پر دستخط کردوں گا۔

اس رویہ کو ہم مصلحت پسندی کا نام دیتے ہیں۔ اس لئے سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا مصلحت پسندی ایک اچھا عمل ہے، یا اس کے معاشرے پر مضر اثرات ہوتے ہیں۔ اس مصلحت پسندی کا سب سے پہلے جو نتیجہ نکلتا ہے وہ یہ کہ ہمارے دانشوروں اور اسکالروں کی معاشرہ میں کوئی عزت نہیں رہتی ہے۔ ان کی بات پر یقین نہیں کیا جاتا ہے، ان کی رائے کو قابل اعتبار نہیں سمجھا جاتا ہے، اور ان کی تعریف کے فقرے یا جملے پڑھ کر ہر شخص یہ سمجھ لیتا ہے کہ یہ روایتی ہیں، ان کی کوئی اصل حقیقت نہیں ہے۔ اس کی وجہ سے کتابوں کے اجراء یا ریویو کرنے پر جو رائے دی جاتی ہے وہ کتاب کی فروخت یا اس کی مقبولیت کا باعث نہیں ہوتی ہے۔

اس مصلحت پسندی کا دوسرا نقصان یہ ہے کہ جب کتاب یا تحریر کا تنقیدی جائزہ نہیں لیا جائے اور اس کی غلطیوں کی جانب اشارہ نہیں کیا جائے تو وہ غلطیاں قارئین میں پھیل جاتی ہیں، اور مصنف بھی ان سے آگاہ نہیں ہوتا ہے اور اپنی تحریروں میں ان کو بار بار دہراتا ہے۔ جب کوئی تحریر اس طرح سے بغیر کسی تنقید کے شائع ہوجائے، تو مصنف میں یہ احساس نہیں رہتا کہ وہ تحقیق میں محنت کرے، اور جہاں اسے شک وشبہ ہے اس کا بار بار جائزہ لے۔

مغربی ملکوں میں یہ رواج ہے کہ کتاب کو شائع کرنے کے لئے پہلے مصنف اس کا مسودہ اپنے دوستوں اور ماہرین کو دکھاتا ہے جو اس کا بغور تنقیدی جائزہ لیتے ہیں۔ اگر اس میں خامیاں ہیں تو ان کی جانب اشارہ کرتے ہیں۔ مقصد یہ ہوتا ہے کہ کتاب شائع ہونے کے بعد اس میں

غلطی کا امکان نہ رہے۔ یہ رواج ہمارے ہاں نہیں ہے، کیونکہ مصنف دوسروں کو اس قابل نہیں سمجھتا ہے کہ ان سے مشورہ لے، یا ان کی تنقید کو برداشت کرے۔ ہمارے ہاں یہ رواج بھی عام ہے کہ دوسروں کی کتابوں سے حوالہ جات لے لئے جائیں اور ان کا اعتراف نہیں کیا جائے، بلکہ اس طرح سے انہیں اپنی تحریر میں شامل کیا جائے جیسے کہ یہ ان کی ہیں۔ اگر انگریزی یا غیر ملکی زبانوں کی کتابوں سے حوالے لئے جاتے ہیں تو یہ سمجھا جاتا ہے کہ اردو کے قارئین ان سے ناواقف ہوں گے اور یہ ان کی تحقیق یا کام کا حصہ بن جائے گا۔ ہمارے ہاں چوری کا یہ سلسلہ تحقیقی مضامین ہی میں نہیں بلکہ ادب اور شاعری میں بھی ہے کہ جہاں سے خیالات کو لے کر اپنے نام سے بغیر اعتراف کے شائع کر دیا جاتا ہے۔ اس سلسلہ میں مثنیٰ صاحب کی کتاب ''چہ دلاورا ست دز داں کہ بکف چراغ دارد'' میں انہوں نے بڑے بڑے علماء اور فضلاء کی چوریوں کو پکڑ کر ان کو بے نقاب کیا ہے۔

اس وجہ سے ہمارے دانشوروں کی یہ پالیسی کہ سب کو خوش رکھیں، اور کسی پر تنقید کر کے اس کی خامیوں سے آگاہ نہ کریں، اس نے ہمارے ادب، شاعری، اور تخلیقی تحریروں کو معیاری بنانے سے روکا ہے۔ جب تک کسی دانشور کی تحریر میں تخلیقی صلاحیتوں کا اظہار نہ ہو، اور تحقیق کے فن میں احتیاط اور محنت کارفرما نہ ہو، ایسی تحریریں بے جان اور کھوکھلی ہو جاتی ہیں، اور یہ ہمارے ہاں ہو رہا ہے۔

مصلحت پسندی کے سلسلہ میں ہمیں یہ بھی نہیں بھولنا چاہئے کہ جب یہ رویہ عام ہو جاتا ہے تو اس کے نتیجہ میں منافقت، جھوٹ اور ریا کاری جنم لیتی ہے۔ یہ رویئے فرد کے کردار کو بدل دیتے ہیں، اس میں سچ بولنے، اور حقیقت کو بیان کرنے کا حوصلہ نہیں رہتا ہے۔

اس مصلحت پسندی کا ایک اہم مظہر ہم یہ دیکھتے ہیں کہ ادب، یا سماجی علوم کی تحقیق کہ جن کا کام معاشرے میں سیاسی وسماجی شعور کو پیدا کرنا ہوتا ہے، وہ اس میں ناکام ہو جاتے ہیں اور اس کی جگہ ایک بنجر اور کھوکھلا ادب و تحقیق کو پیدا کرتے ہیں کہ جن کا معاشرے کے ذہن پر کوئی اثر نہیں ہوتا ہے۔

مصلحت کی وجہ سے معاشرے میں آمریت یا بدعنوان حکومتوں کے خلاف جو مزاحمت کے جذبات ہیں وہ بھی ختم ہو جاتے ہیں اور اس پالیسی کو اختیار کیا جاتا ہے کہ حالات سے سمجھوتہ کر لیا

جائے اور فرد کو تقدیر کے حوالے کر دیا جائے۔ اس لئے ہم دیکھتے ہیں کہ پاکستان میں مزاحمت کی جگہ سمجھوتہ کرنے اور مفاہمت کرنے کی پالیسی کو اختیار کر کے ہر آمر اور بدعنوان شخص کو حکومت کرنے کا موقع دیا گیا اور اس کی حاکمیت کو تسلیم کر لیا گیا۔

اس لئے یہ مصلحت پسندی جب ادب سے نکل کر سیاست، اور سماجی امور میں آتی ہے تو اس کے اور بھی تباہ کن نتائج نکلتے ہیں۔ معاشرے میں تبدیلی کے جذبات ختم ہو جاتے ہیں۔ لوگوں میں ناانصافی اور ظلم برداشت کرنے کی عادت ہو جاتی ہے، اور مخالفت کے ڈر سے ظالم کے خلاف آواز اٹھانے سے لوگ خوف زدہ ہو جاتے ہیں۔

لہٰذا جب تک لوگوں میں حقیقت شناسی کا جذبہ پیدا نہیں ہو گا، اور زندگی کے ہر شعبہ میں، خوش کرنے کے بجائے، غلطیوں اور خامیوں کی نشان دہی نہ کریں گے معاشرے میں مثبت تبدیلی نہیں آئے گی۔

موقع پرستی

تاریخ کے ہر دور اور عہد میں ایسے افراد موجود رہے ہیں کہ جو اپنے ذاتی مفادات کے لئے ہر آنے والے اقتدار کا ساتھ دیتے ہیں اور اپنی وفاداری کو بدلتے رہتے ہیں۔ ان کے نزدیک ذاتی مفادات کی خاطر اقتدار سے سمجھوتہ کرنا، اور خود کو وقت کے ساتھ تبدیل کرنا، ان کی زندگی کے لئے ضروری ہے کیونکہ اس صورت میں وہ صاحب اقتدار سے مراعات اور سہولتیں حاصل کرتے ہیں۔ جو افراد اس اصول پر عمل کرتے ہیں، ان کے لئے موقع پرستی ایک فن بن جاتا ہے کیونکہ وفاداری کو تبدیل کرنا، اور ہر آنے والے صاحب اقتدار کو اپنی وفاداری کا یقین دلانا بظاہر بڑا مشکل نظر آتا ہے۔ مگر جب نظام حکومت بادشاہت تھا اور شاہی خاندان بدلتے رہتے تھے یا غیر ملکی خاندان بزور فوجی طاقت اقتدار پر قابض ہوتے تھے تو اس صورت میں انہیں بھی ایسے افراد کی ضرورت ہوتی تھی کہ جو ان کے ساتھ تعاون کریں، اور حکومت کو چلانے میں ان کا ساتھ دیں۔

اس لئے نئے اقتدار میں آنے والے، ان افراد کی تلاش کرتے ہیں، ان میں بعض اپنے اصول پر قائم رہتے ہیں، اور اپنی پرانی وفاداری کو تبدیل نہیں کرتے، بعض فوراً حالات سے سمجھوتہ کر کے اقتدار میں شریک ہو جاتے ہیں۔

چین میں جب منگولوں کے سردار قبلائی خان نے چینی حکمران خاندان کو تخت و تاج سے محروم کر کے اپنی حکومت قائم کی، تو اس کے وزیر نے، جو کہ قدیم خاندان کا بے انتہا معتمد تھا اور تجربہ وانتظام میں ماہر تھا، اس سے کہا کہ وہ اس کا ساتھ دے۔ اس پر اس نے جواب دیا کہ وہ دو آقاؤں کا وفادار نہیں ہوسکتا ہے۔ قبلائی خان کو اس کا یہ جواب پسند نہیں آیا اور اسے قتل کرا دیا۔

دوسری جانب ارغون خاندان نے سندھ کو فتح کر کے اسے اپنی حکومت میں شامل کر لیا تو ان کو اقتدار کے بعد، موقع پرست لوگ مل گئے جنہوں نے اپنی وفاداریاں اس خاندان سے بدل کر

ان کے ساتھ وابستہ کرلیں۔ان میں سے ایک قاضی قافن تھے جو بطور عالم بڑے مشہور تھے۔جب ارغونوں نے ان سے مشورہ کیا کہ اقتدار کو کیسے مستحکم کیا جائے اور پرانے خاندان کے اثرات کو کیسے مٹایا جائے تو قاضی قافن نے جواب دیا کہ جب جھاڑیوں میں کانٹے زیادہ ہو جائیں، تو اس صورت میں کانٹوں کا صفایا کر دینا چاہیئے۔کہنا یہ تھا کہ پرانے دور کے امراء جو ان کے مخالف ہیں، ان کا قتل عام کر کے، مخالفت کے تمام ذرائع کو ختم کر دینا چاہیئے۔

ایک اور دلچسپ واقعہ ہمایوں کے دور میں پیش آیا، جب اس نے گجرات کو فتح کیا اور اس کے حکمران بہادر شاہ کو شکست دیدی تو بہادر شاہ کے کچھ امراء ہمایوں کے ساتھ ہو گئے، ان میں سے ایک امیر رومی خاں تھا۔ایک دن ہمایوں دربار میں بیٹھا ہوا تھا کہ رومی خاں آداب کے لئے آیا۔بہادر شاہ کے ایک طوطے کا پنجرہ دربار کے کمرے میں لٹکا ہوا تھا، طوطے نے جیسے ہی رومی خاں کو دیکھا تو وہ رٹ لگانے لگا، رومی خاں غدار، رومی خاں غدار، پورے دربار میں سناٹا چھا گیا۔ ہمایوں نے رومی خاں کی جانب دیکھ کر کہا اگر کوئی انسان یہ کہتا تو میں اس کا سر فوراً قلم کرا دیتا، مگر میں اس پرندے کا کیا کر سکتا ہوں۔

اس سے یہ اندازہ ضرور ہوتا ہے کہ عام لوگ موقع پرستوں کی عزت نہیں کرتے ہیں، اور ان کی موقع پرستی کو غداری کے برابر مانتے ہیں، یہی وجہ تھی کہ لوگوں میں رومی خان کے بارے میں غدار کا لفظ استعمال کیا جاتا تھا، اور طوطے نے اسے سن کر رٹ لیا، جو لوگ اس کو غدار سمجھتے تھے ان میں اتنی جرات اور ہمت نہ تھی کہ بادشاہ کے سامنے اس کا اظہار کرتے، مگر ایک پرندے نے ان کے جذبات کا اظہار کر دیا۔

چاہے لوگ موقع پرستوں کا احترام کریں یا نہ کریں، انہیں اس کی پرواہ نہیں ہوتی ہے اور وہ اپنے ذاتی فائدے کے لئے ہر نئے اقتدار کا ساتھ دیتے رہتے ہیں۔

ظہیر دہلوی نے اپنی کتاب داستانِ غدر میں لکھا ہے کہ جب 1857ء کے ہنگامہ میں دہلی پر انگریزوں کا قبضہ ہوتا ہے تو انہوں نے مخبروں کے ذریعہ اپنے مخالفوں کی تلاش شروع کی۔ان مخبر حضرات نے انگریزوں کو خوش کرنے کے لئے معصوم لوگوں کو بھی باغی بنا دیا۔انہیں ایک باغی کی نشان دہی پر دو روپیہ ملا کرتے تھے۔اس رقم کی خاطر وہ تلاش کے بعد لوگوں کو پھانسی دلوا رہے تھے۔ ظہیر دہلوی کا کہنا ہے کہ یہ مخبر وہ لوگ تھے کہ جب دہلی پر جنگ آزادی کے سپاہیوں کا قبضہ

تھا تو یہ اس وقت ان کے ساتھ تھے اور جنگ آزادی کے مخالفوں کی نشان دہی کر کے ان کی نظروں میں باوقار ہو رہے تھے اور مالی منفعت حاصل کر رہے تھے۔ شکست کے بعد فوراً ہی ان لوگوں نے اپنی وفاداری کو بدل لیا۔

اس صورت حال کو ہم موجودہ دور میں بھی دیکھتے ہیں، ایران میں جب شاہ کا تختہ الٹا گیا اور اسلامی انقلاب آیا تو ساوک کے ایجنٹ جو شاہ کے مخالفوں کو اذیت دینے، مارنے اور اغوا کرنے کا کام کرتے تھے، وہ ایرانی انقلاب کے حامی بن کر اب اس کے مخالفوں کو سزائیں دینے لگے۔ اس سوال کا جواب کہ یہ نئی حکومتیں کیوں ان لوگوں کی وفاداری کو تسلیم کر کے ان سے کام لیتے ہیں، تو اکثر یہ دلیل دی جاتی ہے کہ اپنے ابتدائی دور میں انہیں تجربہ کار لوگوں کی ضرورت ہوتی ہے، اس لئے اگر کوئی رضا کارانہ طور پر ان کی خدمات پر آمادہ ہو تو کیوں نہ ان سے فائدہ اٹھایا جائے۔

پاکستان کی اس مختصر تاریخ میں ہمیں موقع پرستوں کے گروہوں کی تعداد بغیر کسی شرم اور پشیمانی کے سرگرم عمل نظر آتی ہے۔ ان میں سیاستدانوں، نوکرشاہی کے افسران، صحافی اور دانشور بھی شامل ہیں۔ قدرت اللہ شہاب جنہوں نے ایوب خاں کی آمریت میں ان کا ساتھ دیا، پروگریسیو پیپرز کو بند کر دیا، رائٹرز کلب قائم کر کے ادیبوں اور شاعروں کو حکومت کا وفادار بنانے کی کوشش کی۔ شہاب نامہ میں بڑے اصول پرست اور جمہوریت نواز نظر آتے ہیں۔ افسوس اس بات کا ہے کہ پاکستان کے معاشرے میں ان موقع پرستوں کو برا نہیں سمجھا جاتا ہے اور یہ قابل احترام رہتے ہیں۔ سیاستدانوں کی ایک بڑی تعداد نے ضیاءالحق کی آمریت میں اس کا ساتھ دیا، اس کی مجلس شوریٰ کے ممبر رہے، اس کی کابینہ میں وزیر رہے، ان میں آج کئی حضرات اہم سیاسی جماعتوں کے رکن ہیں اور عوام اور جمہوریت کے دعویدار ہیں۔ ضیاءالحق جب اہل قلم کانفرنس کرتے تھے تو اس ملک کے تمام نامور ادیب و شاعر ان میں شرکت کرتے تھے اور اس پر فخر کرتے تھے۔ حفیظ جالندھری نے تو ایک بیان میں کہا تھا کہ ضیاءالحق کے دور میں پاکستان کے ادیبوں نے قصر صدارت کو بھی دیکھ لیا۔ ان کی نظر میں شاید ان کے لئے زندگی کی یہ معراج تھی، یہی وہ شاعر تھے کہ برطانوی دور میں لوگوں کو زبردستی فوجی بھرتی کرانے میں حصہ لے رہے تھے اور یہ نظم کہہ رہے تھے کہ میں تو ''چھورے کو بھرتی کرا آئی رے'' بعد میں یہ قومی ترانے کے خالق بن کر معاشرے میں قابل احترام ہو گئے۔

کچھ لوگوں نے صحافیوں کی قلابازیاں، سیاستدانوں کی قلابازیاں، اور دانشوروں کی قلابازیوں پر کتابیں لکھی ہیں، مگر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے معاشرے میں اصول پرستی، نظریہ سے وابستگی اور ایمانداری کے جذبات کا خاتمہ ہوگیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ موقع پرست افراد بغیر کسی خوف اور ڈر کے بار بار اپنی وفاداری بدلتے ہیں، اور فائدے اٹھاتے ہیں۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اگر کسی معاشرے میں موقع پرستی کے جذبات پھیل جائیں، تو اس کے اثرات کیا ہوں گے؟ اس صورت میں معاشرے میں بدعنوانی، اور خرابیوں کے خلاف مزاحمت ختم ہو جائے گی، جو افراد اصول پسند ہیں، وہ تنہائی کا شکار ہو کر بے عمل ہو جائیں گے اور لوگوں کے لئے رول ماڈل یہی موقع پرست اور بدعنوان افراد ہوں گے، اس لئے معاشرے میں ملک وقوم کے مفادات کو قربان کر کے ذاتی مفادات کے حصول کا جذبہ بڑھ جائے گا۔ پاکستان کا معاشرہ اس وقت اس صورت حال سے دوچار ہے، ہمارے ہاں کوئی امریکی مفادات کے لئے کام کر رہا ہے تو کوئی مغربی ملکوں کے تسلط کو فروغ دینے میں مصروف ہے، اور یہ سب اب کھلے عام ہوتا ہے کیونکہ معاشرہ نے اس صورت حال کو قبول کر لیا ہے۔ اس وجہ سے موقع پرستی اب گناہ نہیں ہے نہ ہی خراب جذبہ ہے، بلکہ منطقی طور پر اس کا جواز دیا جاتا ہے کہ جب ملک میں فرد کے تحفظ کی ذمہ داری کسی پر نہ ہو، تو پھر فرد کو اختیار ہے کہ اپنے مفادات کو ہر اخلاقی یا غیر اخلاقی طور پر پورا کرے۔

استاد اور شاگرد

جس زمانے میں، میں پڑھایا کرتا تھا تو کلاس کے پہلے لیکچر میں طالب علموں سے کہا کرتا تھا کہ اپنے بزرگوں کے نقشِ قدم پر قطعی مت چلنا۔ اس پر شروع میں طلباء کو حیرانی بھی ہوتی تھی اور تعجب بھی۔ کیونکہ وہ یہ مقولہ سنتے آئے تھے بزرگوں کے نقشِ قدم پر چلا کرو۔ جب میں اس کی وضاحت کرتا اور انہیں بتاتا کہ نقشِ قدم پر چلنے کا مقصد تقلید ہے اور اگر تقلید کی جائے تو اس صورت میں کوئی فرد اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو نہیں ابھار سکے گا۔ اس کی شخصیت ابھر کر سامنے نہیں آ سکے گی۔ اس کی ذہانت کو جلا نہیں ملے گی اور وہ محض نقل کر کے اپنی صلاحیتوں اور توانائیوں کو کھو دے گا۔

کسی بھی فرد کی شخصیت کی تکمیل اس وقت ہوتی ہے جب وہ اپنی تخلیقی صلاحیتوں کو ابھارتا ہے۔ پرانی روایتوں کو توڑتا ہے اور ایک نئی دنیا کو پیدا کرتا ہے۔ افراد کی تخلیقی صلاحیتوں کو ابھارنے کے لئے تعلیم کا سب سے زیادہ حصہ ہوتا ہے اور نوجوانوں کے ذہن کو بدلنے میں استاد اہم کردار ادا کرتا ہے۔

کسی بھی استاد کی سب سے بڑی خصوصیت یہ ہوتی ہے کہ وہ ایسے شاگرد پیدا کرتا ہے کہ جو آگے چل کر خود استاد کے نظریات کو چیلنج کرتا ہے۔ جس تعلیمی نظام میں یہ خوبی ہو۔ وہاں علم کی تحقیق اور تخلیق برابر آگے بڑھتی ہے۔ نظریات اور افکار ایک جگہ ٹھہرے ہوئے نہیں رہتے ہیں۔ یہ پورا عمل علم اور ذہن کی دنیا میں ایک پہچان پیدا کرتا ہے۔ علم کائنات کے رازوں کے پردے اٹھاتا ہے اور حقیقت ایک کے بعد ایک نئے نظریئے کی روشنی میں پیدا ہوتی رہتی ہے۔

اس کی سب سے اچھی مثال ایونیا (Ionian) کے فلسفیوں میں ملتی ہے۔ جو کائنات کی تخلیق کو جاننے کے لئے کوشاں تھے اور اپنے مشاہدہ کی بنیاد پر اس کے بارے میں سائنسی بنیادیں فراہم کر رہے تھے۔ ''تھے لیس'' (Thales) (وفات 547 ق۔م)۔ تھے لیس نے دنیا کے بارے

میں کہا کہ یہ پانی سے بنی ہے۔لیکن اس کے شاگرد نے اس سے اتفاق نہیں کیا،اوراس کو چیلنج کیا۔ اناکسی مینڈر (Anaximander) اس کا شاگرد (وفات 546ق۔م) نے اس کے اس نظریے سے اتفاق نہیں کیا، اور پھر اس کو چیلنج کرنے والا اس کا شاگرد انیکسا گورس (Anaxagoras) (وفات 428ق۔م) تھا۔

ان تینوں فلسفیوں کے نظریات کے مطابق یہ دنیا پانی، ہوا اور آگ کے عناصر سے وجود میں آئی۔اس سے پتہ چلتا ہے کہ فلسفی کی دنیا کے اس ابتدائی زمانے میں یہ رواج ہو چکا تھا کہ استاد کا احترام تو کرنا چاہئے۔مگر ضروری نہیں کہ اس کی ہر بات کو سچ سمجھ کر اس کو تسلیم کر لینا چاہئے۔استاد کے خیالات سے بغاوت میں علم کو آگے بڑھایا۔

ایتھنز میں جب افلاطون نے اپنی اکیڈمی کھولی تو اس میں ارسطو بحیثیت شاگرد کے داخل ہوا۔وہ بیس سال تک افلاطون کے علم سے فیضیاب ہوا۔لیکن بعد میں جب اس نے کتابیں لکھنا شروع کیں جن میں تقریباً اس وقت کے سارے اہم موضوعات تھے۔اس نے اپنے استاد افلاطون کے نظریات پر سخت تنقید کرتے ہوئے مسترد کر دیا اور اپنے فلسفے کی بنیاد آزادانہ طور پر ڈالی۔

ارسطو نے ایسے شاگرد پیدا نہیں کئے جو اس کے فلسفے اور نظریات کو چیلنج کرتے۔وہ سکندر کا استاد ضرور تھا مگر وہ سکندر کی فتوحات اور اس کے ہاتھوں شکست خوردہ قوموں کے قتلِ عام کو نہیں روک سکا۔اس کا فلسفہ سکندر کی خونریزی کی روک تھام کرنے سے عاجز رہا۔

چونکہ ارسطو کے فلسفے اور نظریات کو چیلنج نہیں کیا گیا اس لئے عہد وسطیٰ میں عیسائی چرچ نے اور خاص طور سے ٹامس اکیونا (Thomas Aquana) نے اس کے افکار اور فلسفے کو عیسائیت کی تعلیمات میں اس طرح سے ہم آہنگ کیا کہ ڈیڑھ ہزار سال تک اس کے نظریات کو چیلنج کرنے کا حوصلہ کسی میں نہ رہا۔اس کی وجہ سے نئے خیالات نے نظریات اور افکار کے دروازے بند کر دیئے۔یہ دروازے اس وقت کھلے جب پندرھویں صدی میں ریناساں کے عہد میں کچھ مفکرین نے اس کے فلسفے پر اعتراضات شروع کئے۔

مسلم دنیا پر بھی ارسطو کی تعلیمات کا گہرا اثر تھا۔فارابی جس نے اس کے فلسفے کی تشریحات کیں۔اس کی وجہ سے اسے معلم ثانی کہا جاتا ہے۔لیکن اس کے فلسفے کی تردید نہیں کی گئی۔

مسلمان فلسفی اگر چہ یونانی فلسفے سے متاثر تو ہوئے لیکن انہوں نے اس سے بغاوت کر کے نئے نظریات کی بنیاد نہیں ڈالی۔

انیسویں صدی میں جرمنی میں ہیگل کے فلسفے نے تعلیم یافتہ طبقے کو متاثر کیا۔ کارل مارکس نے ہیگل کے فلسفے کو پڑھ کر خود کو اس کا شاگرد کہا لیکن بعد میں اس نے علیحدہ راہ نکال کر یہ اعلان بھی کیا کہ اس نے ہیگل کے فلسفے کو سیدھا کھڑا کر دیا ہے۔ اس کے جدلیاتی فلسفے سے اس نے تاریخ کا مادی نظریہ تخلیق کیا۔

اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ جب تک نظریات کو چیلنج نہیں کیا جائے علم آگے نہیں بڑھتا ہے۔

بدقسمتی سے پاکستان کے تعلیمی اداروں میں یہ روایت نہیں ہے۔ شاگرد استاد سے سوال کرتے ہوئے ڈرتا ہے اور اس کے خیالات کو بغیر کسی تنقید کے قبول کر لیتا ہے۔ اس لئے ہمارے تعلیمی اداروں میں نظریات کی تقلید ہوتی ہے نئے نظریات تخلیق نہیں ہوتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ ہمارے تعلیمی ادارے فلسفی، ماہر عمرانیات، سیاسیات، نفسیات اور علم بشریات وغیرہ پیدا کرنے میں ناکام ہو گئے۔

اس لئے جب تک تقلید کی زنجیروں کو نہیں توڑا جائے گا فرسودہ روایات سے آزاد نہیں ہوا جائے گا۔ اس وقت تک نہ تو علم ذہنوں کو تبدیل کر سکے گا اور نہ ہی سوسائٹی ترقی کر سکے گی۔

اس کے برعکس امریکہ اور مغرب کے تعلیمی اداروں میں شاگرد، استاد کے نظریات کو چیلنج کرتے ہیں۔ وقت کے تقاضوں کے تحت علم کی تشکیل کرتے ہیں یہی وجہ ہے کہ ان کے معاشروں میں نظریات و افکار کے درمیان تصادم اور کشمکش رہتی ہے جس کے نتیجے میں علم ایک جگہ جامد اور ٹھہرا ہوا نہیں رہتا بلکہ برابر متحرک رہتا ہے۔

خاص طور سے سائنس اور ٹیکنالوجی کی وجہ سے جو تبدیلیاں آ رہی ہیں۔ سماجی علوم کے ماہر ان کا جائزہ لیتے ہوئے معاشرے کی نئی تشکیل میں مدد کر رہے ہیں۔

کیا یہ ممکن ہے کہ ہمارے تعلیمی اداروں کو نئے حالات کے تقاضوں کے تحت ڈھالا جائے تاکہ وہ ایسے علوم پیدا کریں جو نئے چیلنجوں کا مقابلہ کر سکیں۔

نجی جائیداد

فرانس کا فلسفی روسوانسانی تہذیب کے ابتدائی دور کو جو شکار اور غذا جمع کرنے کا تھا اسے ایک مثالی عہد قرار دیتا ہے۔ کیونکہ اس میں نجی جائیداد کا کوئی ادارہ نہ تھا اور سب انسان برابر تھے۔ لیکن جب زرعی معاشرے کی ابتداء ہوئی اور بقول روسو جس شخص نے پہلی مرتبہ یہ کہا کہ یہ زمین میری ہے اس نے نجی جائیداد کے تصور کو پیدا کیا اور معاشرے میں سماجی اور معاشی ناہمواری کی بنیاد ڈالی۔

جب سے معاشرے میں نجی جائیداد رکھنے والوں اور جائیداد سے محروم لوگوں کی تقسیم ہوئی اس وقت سے معاشرے میں ناانصافی طاقت کا بے جا استعمال اور محروم طبقے کا استحصال شروع ہوا۔ نجی جائیداد کے اداروں نے معاشرے کی روایات رسم ورواج اور رویوں کو تبدیل کیا۔

جیسا کہ اینگلز نے لکھا ہے کہ اس کی وجہ سے معاشرے میں عورت کا مقام گر گیا۔ کیونکہ نجی جائیداد کی وجہ سے یہ اس کی ذمہ داری ٹھہری کہ وہ اس کا وارث پیدا کرے۔ لہٰذا عورت کی حیثیت ملکیت کی ہوگئی۔

بادشاہت کے زمانے میں حکمرانوں کو سب سے زیادہ یہ فکر ہوتی تھی کہ ان کا کوئی وارث ہونا چاہئے۔ اس عمل میں اکثر تخت و تاج کے اتنے وارث پیدا ہو جاتے تھے کہ ان کے درمیان خانہ جنگی اور خونریزی اس کا یہ فیصلہ کرتی تھی کہ تخت کا وارث کون ہوگا۔ جو حکمراں بغیر وارث کے مر جاتے تھے تو اس کی حکومت پر کوئی بھی طاقت ور قبضہ کر لیتا تھا۔

بعض اوقات وارث نہ ہونے کی صورت میں کسی لڑکے کو گود لے کر اسے وارث بنا لیا جاتا تھا۔ تاکہ حکومت ایک ہی خاندان میں رہے۔

یورپ میں امراء نے اپنی جائیداد کو محفوظ رکھنے اور ٹکڑے ٹکڑے ہونے سے بچانے کے لئے ایک قانون بنایا تھا جو Law of Primogeniture کہلاتا تھا۔ اس کے تحت بڑا لڑکا جائیداد کا

وارث ہوتا تھا۔ جبکہ دوسرے بیٹوں کو اس سے محروم کر دیا جاتا تھا۔ دوسرے بیٹے یا تو فوج میں ملازمت کرتے تھے یا چرچ کے عہدیدار ہو جاتے تھے۔

ایک تیسرا طریقہ یہ تھا کہ وراثت کا دعویدار لڑکوں اور لڑکیوں کو چرچ کی خانقاہوں میں داخل کر دیا جاتا تھا جہاں وہ زندگی کے تمام ایام وہیں گزارتے تھے۔ اس کی وجہ سے یورپ کے عہدِ وسطیٰ میں خانقاہوں کا قیام بڑی تعداد میں عمل میں آیا۔

تاریخ میں نجی جائیداد کے ادارے کو مقدس مقام کا درجہ دیا گیا، اور حکومت کی یہ ذمہ داری ٹھہری کہ وہ اس ادارے کی حفاظت کرے۔ اس کے علاوہ مذہبی اور اخلاقی روایات کے تحت بھی اس ادارے کو قائم رکھنے کی ہدایت کی گئی۔ کیونکہ نجی جائیداد رکھنے والوں کے پاس طاقت، دولت، مالی وسائل اور اثر و رسوخ ہوتا تھا۔ اس لئے وہ اس کی پوری طرح سے حفاظت کرتے تھے۔ مگر ان کو یہ ڈر رہتا تھا کہ لوگوں کی اکثریت جو غربت، مفلسی اور محرومی کا شکار ہے وہ ان کی جائیداد پر قبضہ کرنے کے لئے بے چین ہے۔ لہٰذا حکومت کی جانب سے جو قوانین بنائے گئے ان میں نجی جائیداد کے تحفظ کے لئے دفعات رکھیں اور فرانس کے 1789ء کے ہونے والے انقلاب میں نیشنل اسمبلی میں اپنے ڈیکلیریشن (Rights of man and Citizen) میں نجی جائیداد کو تحفظ فراہم کیا۔ جب فرانس کے کسانوں نے اپنے حقوق کی حمایت میں بغاوت کی جاگیرداروں کی حویلیوں پر حملے کئے اور ان پر لگائے ہوئے ٹیکس کی دستاویزات کو آگ لگائی تو انقلابی حکومت نے ان بغاوتوں کو سختی سے کچل دیا۔

یورپ کے برعکس برصغیر ہندوستان میں نجی جائیداد کا تصور نہیں تھا۔ یہاں حکمران امراء کو جو جائیداد دیتے تھے وہ ان کی ملازمت کے ختم ہونے کے بعد واپس ریاست کے پاس آ جاتی تھی۔ فرانسیسی سفیر برمیر (Bermier) نے جو شاہجہاں کے زمانے میں ہندوستان آیا اس نے اس پر تنقید کرتے ہوئے لکھا کہ چونکہ یہ جاگیریں ان کی نجی جائیداد نہیں ہیں اس لئے جاگیردار ان کی زرعی پیداوار کی ترقی میں دلچسپی نہیں رکھتے ہیں، ان کا واحد مقصد یہ ہوتا ہے کہ اپنی ملازمت کے دوران اپنی جائیدادوں سے زیادہ سے زیادہ دولت اکٹھی کریں۔ اس کے برعکس اس کے خیال میں نجی جائیداد کی وجہ سے یورپ کے جاگیردار اس کی ترقی میں دلچسپی رکھتے تھے۔

جب ہندوستان میں برطانوی حکومت قائم ہوئی تو انہوں نے نجی جائیداد کے ادارے کو قانونی حیثیت دی۔ اس کا مقصد تھا کہ اس کے ذریعہ جاگیرداروں کا ایک وفادار طبقہ پیدا کیا

جائے۔جس میں وہ کامیاب ہوئے اوراس طبقے نے آخر وقت تک برطانوی حکومت سے تعاون کیا اوراپنی وفاداری کو قائم رکھا۔

تاریخ کے تناظر میں اسکالرز اس پر بحث کرتے رہے ہیں کہ کیا نجی جائیداد کا تحفظ معاشرے کی ترقی میں معاون ثابت ہوتا ہے یا رکاوٹ بنتا ہے۔فرانس کے ایک سوشلسٹ مفکر پرودھن (Proudhan) نے اس کی تعریف کرتے ہوئے سوال کیا ہے کہ ''نجی جائیداد کیا ہے؟'' پھراس کا مختصر جواب دیا ہے کہ ''یہ چوری ہے'' It is theft۔سوشلسٹ مفکرین کے نزدیک نجی جائیداد کی وجہ سے ایک ایسے خاندان کا تصور اُبھرتا ہے جواعلیٰ نسب کا ہوتا ہے جس میں اعلیٰ کردار کی خوبیاں ہوتی ہیں اور جس کو یہ حق ہوتا ہے کہ وہ عام لوگوں پر حکومت کرے۔

اس طبقاتی تقسیم کی وجہ سے صاحب جائیداد طبقہ کو اعلیٰ تعلیم کے مواقع ملتے ہیں جس کی وجہ سے حکومت کے اعلیٰ عہدوں پر وہی لوگ فائز ہوتے ہیں اور یہی لوگ ریاست کے اداروں کو اپنے مفادات کے لئے استعمال کرتے ہیں۔

پاکستان میں جمہوریت کی ناکامی کی ایک وجہ یہی جاگیردار طبقہ ہے جو اپنے خاندان وراثت اور اعلیٰ نسبی کے باعث بار بار منتخب ہوتے ہیں اور ہر سیاسی، سماجی اور معاشی تبدیلی کی مخالفت کرتے ہیں۔لیکن نجی جائیداد کے تحفظ کے لئے کبھی قوم پرستی کے جذبات کو اُبھارا جاتا ہے اور کبھی حب الوطنی کے نعرے لگائے جاتے ہیں۔لیکن جب ملک کسی بحران کا شکار ہوتا ہے یا بیرونی مداخلت ہوتی ہے تو یہی لوگ اپنی جائیدادوں کو بچانے کے لئے اپنی وفاداریاں بدل لیتے ہیں۔

ان حقائق سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ نجی جائیداد کے ادارے پر اشرافیہ کا قبضہ رہے گا وہ ملک کی سیاست، معیشت اور سماجی امور پر قابض رہیں گے اور عام لوگوں کو آگے بڑھنے کے مواقع نہیں ملیں گے۔

اس ذہنیت کا اندازہ ہمارے ملک کی سیاسی جماعتوں سے بھی ہوتا ہے کہ جن کے سربراہ انہیں اپنی ذاتی ملکیت سمجھتے ہیں اور بطور وراثت اس کی رہنمائی اپنے خاندان میں منتقل کرتے ہیں ان سیاسی جماعتوں میں سیاسی کارکنوں کی مثال مزارعین کی سی ہوتی ہے۔جو جاگیردار کی طرح پارٹی کے سربراہ اور اس کے خاندان کے وفادار ہوتے ہیں۔

جب تک سیاسی پارٹیوں کا یہ جاگیردارانہ کلچر ختم نہیں ہوگا اس وقت تک ملک میں حقیقی جمہوریت نہیں آسکے گی۔

تعلیم اور عوام

علم کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ ایک زبردست طاقت ہے۔ کیونکہ اس کے ذریعہ لوگوں کو آگہی اور شعور ملتا ہے۔ اس وجہ سے صاحب اقتدار اور مراعات یافتہ طبقوں کی یہ پالیسی رہی ہے کہ اسے عوام سے دور رکھا جائے تا کہ وہ جن حالات میں رہ رہے ہیں، انہیں فطری تسلیم کرتے ہوئے، اداروں، روایات اور رسم و رواج کو چیلنج نہیں کریں، اور اطاعت گزار رعایہ کی حیثیت سے اشرافیہ کے تسلط کو قائم رکھیں۔ تاریخ میں علم پر اشرافیہ کے طبقے کی اجارہ داری اسی وجہ سے تھی کہ اس کے ذریعہ لوگوں کو محکوم رکھا جائے۔ چنانچہ ہندو مذہب میں برہمنوں نے علم کو اپنی ملکیت قرار دے کر، کم ذات کے لوگوں کو اس سے دور رکھا تھا۔ امریکہ میں جہاں افریقہ سے غلاموں کو لایا گیا تھا، وہاں قانونی طور پر ان افریقی غلاموں کے لئے تعلیم حاصل کرنا یا لکھنا پڑھنا جرم تھا، جس کی سخت سزا تھی۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ جب تک کم ذات کے لوگ، اور عوام حقیقت سے بے خبر رہیں گے، وہ حکمراں طبقے کے احکامات پر عمل کریں گے، اور اپنے حقوق کے لئے نہ کوئی بغاوت کریں گے۔ کیونکہ انہیں اس بات کا ڈر تھا کہ تعلیم نہ صرف ان میں احساس اور شعور پیدا کرے گی، بلکہ ان کی ذہانت، صلاحیت اور لیاقت کو بھی جلا بخشے گی جس کی وجہ سے وہ ان کے برابر ہونے کی کوشش کریں گے اور جن مراعات پر ان کا قبضہ ہے، اس میں انہیں شریک کرنا پڑے گا۔

اس ذہنیت کا اظہار ضیاء الدین برنی نے جو کہ تغلق دورِ حکومت کا مورّخ تھا، اس نے اپنی کتاب فتاویٰ جہانداری میں کیا ہے۔

"یعنی کمینوں، رذیلوں اور نکموں کو، دوکانداروں اور کم اصلوں کو نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج کے ارکان اور قرآن کے کچھ پاروں اور کچھ دینی عقائد سے زیادہ کی تعلیم نہ دی۔ جن کے بغیر ان کا ایمان مکمل نہیں ہوسکتا، اور ان کی عبادات کا درست ہونا ممکن نہیں ہے۔ لیکن اس کے علاوہ انہیں

کچھ بھی نہ پڑھائیں کہ کہیں ان کمین نفوس کو عزت نہ مل جائے۔''

برنی نے ان خیالات کا اظہار عہد وسطیٰ میں کیا تھا۔ جب کہ سرسیّد احمد خاں جو کہ مسلمان اشراف کے لئے تعلیم ضروری خیال کرتے ہیں۔ ان کے نزدیک کم ذات، اور نچلے درجہ کے مسلمانوں کے لئے جدید تعلیم کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔اس کا اظہار انہوں نے رائے بریلی کے ایک مدرسہ کے افتتاح میں ان الفاظ میں کیا تھا۔

آپ نے اپنے ایڈریس میں ذکر کیا ہے کہ ہم کو دوسری قوم کے علوم پڑھانے میں بھی عذر نہیں ہے۔ شاید اس فقرے سے انگریزی پڑھانے کی طرف اشارہ کرنا مقصود ہے۔مگر میں کہتا ہوں کہ ایسے مدرسہ میں، جیسا کہ آپ کا مدرسہ ہے انگریزی پڑھانے کا خیال ایک بہت بڑی غلطی ہے۔اس میں کچھ شک نہیں ہے کہ ہماری قوم میں انگریزی زبان اور انگریزی علوم کی تعلیم کی اشد ضرورت ہے۔ ہماری قوم کے سرداروں اور شریفوں کو لازم ہے کہ اپنی اولاد کو انگریزی علوم کی اعلیٰ درجہ تک تعلیم دیں۔ مجھ سے زیادہ کوئی شخص نہ لگے گا جو مسلمانوں میں انگریزی زبان اور انگریزی علوم کی ترقی دینے کا حامی اور خواہش مند ہو۔مگر ہر ایک کے لئے موقع اور عمل ہے۔اس وقت میں نے دیکھا کہ آپ کے اس مدرسہ میں مسجد کے صحن میں جس کے قریب آپ مدرسہ بنانا چاہتے ہیں، لڑکے پڑھ رہے ہیں جس حیثیت اور درجہ کے یہ لڑکے ہیں۔ان کو انگریزی پڑھانے سے کوئی فائدہ مرتب نہیں ہونے لگا۔ان کا اس قدیم طریقہ عام میں مشغول رکھنا ان کے حق میں اور ملک کے حق میں اور قوم کے حق میں زیادہ تر مفید ہے۔

تعلیم کے بارے میں جو نظریات عہد وسطیٰ میں ضیاءالدین برنی کے تھے، اور جدید عہد میں سرسیّد احمد خاں کے تھے، وہی نظام تعلیم آج بھی پاکستان میں قائم ہے۔ غریب غرباء کے لئے مدرسہ ہے کہ جہاں انہیں بنیادی مذہب کی تعلیم دی جاتی ہے کہ جو انہیں مسجد میں موذن و امام ہونے کے مواقع فراہم کرتی ہے۔ اس کے علاوہ یہ مدرسہ کے فارغ التحصیل طالب علم عملی زندگی میں مذہبی رسومات کی ادائیگی میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ پیدائش، شادی اور موت کی رسومات میں ان کی شرکت لازمی ہوتی ہے۔امراء اور درمیانہ طبقے کے لوگ جب میلاد کی محفلیں، یا قرآن خوانی کا انتظام کرتے ہیں، تو ان میں بھی ان کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس لحاظ سے مدرسہ کے یہ غریب طالب علم ہمارے طبقاتی معاشرے میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔

درمیانہ طبقہ کے طالب علموں کے لئے حکومت کے اسکول اور کالجز ہیں کہ جہاں انہیں اس قدر تعلیم دیدی جاتی ہے کہ وہ دفتروں میں کلرک یا دوسرے کم درجہ کے انتظامی کاموں کو نمٹا سکیں۔ اشرافیہ کے لئے اوّل تو مشنری اسکولز ہیں کہ جہاں وہ مشنریوں کی نگرانی میں تعلیم پاتے ہیں اور اس پر فخر کرتے ہیں کہ وہ کسی مشہور مشنری اسکول میں پڑھتے ہیں۔اب پرائیویٹ اسکولز ان اشراف کی مالی حالت کے مطابق بڑی تعداد میں کھل گئے ہیں جہاں یہ انگریزی زبان میں پختگی کے بعد معاشرے میں اعلیٰ عہدوں اور برتر مرتبہ پر فائز ہونے کے لائق ہو جاتے ہیں۔ جو بہت زیادہ دولت مند ہیں ان کے بچے غیر ملکی اسکولوں اور یونیورسٹیوں میں پڑھ کر ملک میں حکومت کرنے آجاتے ہیں۔

اب رہے عوام جو اَن پڑھ اور جاہل رہیں گے تو یہ لوگ کارخانوں میں مزدور یا امراء کے ڈرائیور، خانساماں، یا گھریلو ملازم کے طور پر بڑی تعداد میں مل جاتے ہیں۔ لہٰذا یہ نظام تعلیم ہمارے طبقاتی معاشرے کو مضبوط بنیادوں پر مستحکم کئے ہوئے ہے۔اس میں ہر طبقہ کے افراد کو اپنی حیثیت اور مرتبہ کا احساس ہے۔ لہٰذا اہل اقتدار اور اشرافیہ اس کے حامی نہیں کہ تعلیم کو عام کیا جائے، اور لوگوں کو اس کے ذریعہ شعور اور آگہی دی جائے۔ اس وجہ سے گورنمنٹ اسکولز دیہاتوں، قصبوں اور چھوٹے شہروں میں جاگیرداروں کے اوطاق ہیں، یا جانوروں کے باڑے، جب تک جہالت اور غفلت میں رہیں گے اس وقت تک اشرافیہ کو سکون واطمینان رہے گا کہ ان کے اقتدار اور مراعات کو چیلنج کرنے والا کوئی نہیں۔

مذہب اور ریاست

تاریخ میں سیاست اور مذہب کا گہرا تعلق رہا ہے۔ قدیم تہذیبوں میں حکمرانوں نے خود کو یا تو دیوتاؤں کی اولاد قرار دیا ہے، یا خود کو دیوتا کے منصب پر فائز کر کے اپنی الوہیت اور روحانی طاقت کو مضبوط کیا ہے۔ مذہب اور سیاست کے اس ملاپ کی وجہ یہ تھی کہ حکمراں خود کو عوام سے ممتاز اور علیحدہ درجہ دے کر انہیں اپنا اطاعت گزار بنائے رکھیں۔ ان کے مذہبی رتبہ کی وجہ سے، انہیں جو تقدس ملتا تھا، وہ ان کے خلاف ہونے والی سازشوں اور بغاوتوں کو بھی نہ روکتا تھا۔ اس تسلسل کو آگے چل کہ یورپ کے حکمرانوں نے الٰہی احکامات (Divine Rights) کے ذریعہ حکومت کی۔ جب کہ مسلمان حکمراں خود کو ظل الٰہی یا خدا کا سایہ کہلانے لگے۔ اس صورت میں وہ خدا کے سامنے جوابدہ تھے، عوام کے سامنے نہیں۔ عوام کا کام ان کی اطاعت اور وفاداری تھی۔

لیکن مذہب اور سیاست میں اقتدار پر اجارہ داری کرنے کی وجہ سے ایک تصادم اور کش مکش ضرور رہی۔ خصوصیت سے یہاں ہم عیسائیت اور اسلام کے کردار کا جائزہ لیں گے کہ ان دونوں مذاہب میں، ان کا ریاست کے ساتھ کیا رشتہ رہا؟ اور اس میں کیا کیا تبدیلیاں آئیں۔

عیسائی مذہب کی خصوصیت یہ تھی کہ اس نے خود کو چرچ کے ادارے کے تحت منظّم کیا تھا۔ یہ چرچ کے عہدے دار ہوتے تھے جو مذہبی لحاظ سے اعلیٰ و ادنیٰ میں تقسیم تھے ان کا سربراہ پوپ تھا۔ چرچ پوری عیسائی دنیا میں گاؤں سے لے کر شہر میں پھیلے ہوئے تھے اور اس کے تمام عہدے دار پوپ کے ماتحت تھے، اس کے وفادار تھے، چرچ کی جانب سے یورپ کے ہر ملک میں مذہبی ٹیکس تھا، جو چرچ کو ملتا تھا، اور وہ اسے روم بھیج دیا کرتا تھا، اس لحاظ سے پوپ کا اقتدار اور تسلط پوری عیسائی دنیا پر تھا، اور چرچ کے ادارے ایک طرح سے ریاست کے اندر ریاست تھے۔ بلکہ ان کا اثر ورسوخ سیاسی حکمرانوں سے زیادہ تھا، کیونکہ یہ عوام کے مذہبی فرائض سرانجام دیتے تھے، جو

پیدائش سے لے کر موت تک تھے۔اس کے علاوہ چرچ میں پابندی سے مذہبی عبادت ادا کرنے کی وجہ سے عام لوگ اس سے ذہنی طور پر وابستہ تھے۔اس کے علاوہ مذہبی تہوار، رسومات، جلوس اور رسومات لوگوں کو عقیدت مند بنائے رکھتی تھیں۔ پوپ کے پاس حکمرانوں اور چرچ سے منحرف ہونے والوں کے لئے زبردست حربہ ان کا عیسائیت سے اخراج تھا۔اس کی وجہ سے یورپ کے حکمراں پوپ سے ڈرتے تھے، اور اس کے احکامات کی خلاف ورزی نہیں کرتے تھے اگرچہ کچھ حکمرانوں نے ضرور اس پر احتجاج کیا، مگر مجموعی طور پر پوپ اور چرچ کا تسلط قائم رہا۔منحرفین کے احتساب کے لئے انکوئیزیشن (Inquisition) کا محکمہ قائم کیا گیا تا کہ چرچ کے خلاف یا عیسائیت کے عقائد کے خلاف اختلافات کو سختی سے ختم کرایا جائے۔ان منحرفین یا باغیوں کو عام طور سے زندہ جلا دیا جاتا تھا۔

جب 1517ء میں لوتھر نے چرچ اور پوپ کے اختیارات کو چیلنج کیا تو اس نے مغربی عیسائی دنیا کو کیتھولک اور پروٹسٹنٹ فرقوں میں تقسیم کر دیا۔اس کی وجہ سے پوپ کی طاقت کمزور ہو گئی۔ اس کے بعد سیاسی تبدیلیوں نے یورپ کے سیاسی نظام کو بدلنے میں حصہ لیا۔جب امریکہ، برطانیہ سے جنگ آزادی کے بعد خودمختار ہوا، اور اس کے راہنماؤں نے دستور کی تشکیل کر لی تو خصوصیت سے انہوں نے اس بات کا خیال رکھا کہ ریاست کو چرچ سے علیحدہ رکھا جائے۔ یہ علیحدگی اس وقت اور بڑھی جب 1789ء میں فرانس میں انقلاب آیا تو اس نے ریاست کو سیکولر بنا دیا۔مزید یہ کہ تعلیم جو اب تک چرچ کے تسلط میں تھی، اسے ریاست کی تحویل میں لے کر قومی کر دیا۔ان تبدیلیوں کی وجہ سے یورپ اور امریکہ میں چرچ کا ریاست پر تسلط نہیں رہا، اور مذہب لوگوں کا نجی معاملہ بن کر رہ گیا۔اگرچہ مغرب کی سوسائٹی میں مذہب کا اثر رہا، مگر مذہب کی سیاسی اہمیت کم ہوتی چلی گئی۔

اسلامی دنیا میں ریاست اور مذہب کے درمیان رشتہ اور تعلق اس وجہ سے مختلف رہا، کیونکہ اسلام میں نہ تو چرچ کی طرح کا کوئی ادارہ تھا اور نہ ہی پوپ کی قسم کا مذہبی راہنما، اس لئے حکمراں کی سیاست طاقت، قوت اور اختیار کے سامنے علماء ایک طرح سے بے بس تھے۔اگرچہ انہیں فتویٰ دینے کی طرح کا اختیار تو تھا، مگر حکمراں کے آگے، اگر وہ فتویٰ اس کے خلاف ہو تو اس پر عمل درآمد ممکن نہیں تھا۔ عام لوگ بھی حکمراں کے تابعدار اور وفادار تھے اس وجہ سے حکمرانوں نے علماء کی

سرپرستی کر کے انہیں حکومت اور ریاست کا تابع بنا دیا، اور علماء نے ان حکمرانوں کی خواہشات پر فتوے دینا شروع کر دیئے۔

تاریخ میں ایسی بہت سی مثالیں ہیں کہ جب کسی بادشاہ نے اپنی کسی خواہش یا منصوبہ کو جائز قرار دینا ہوا تو اس نے علماء سے اپنی مرضی کے مطابق فتوے لے لئے۔

الماوردی نے الاحکام السلطانیہ میں مذہبی طور پر غاصب حکمراں کو بھی تسلیم کرنے کی ہدایت کی تاکہ معاشرہ سیاسی بے چینی اور فتنہ سے محفوظ رہے۔ ہندوستان میں سلطان التمش کے دور حکومت میں علماء کے ایک وفد نے جب اس سے یہ مطالبہ کیا کہ ہندوؤں کو اہل کتاب قرار دے کر، انہیں ذمی کا درجہ دینا، اسلام کے خلاف ہے، لہٰذا یا تو انہیں مجبور کر کے مسلمان بنایا جائے، یا پھر انکار کی صورت میں ان کا قتل عام کیا جائے۔ اس پر سلطان کے وزیر نے جواب دیا کہ اگر چہ ان کا مطالبہ ٹھیک ہے، مگر شاہی اسلحہ خانے میں اتنی تلواریں نہیں ہیں کہ تمام ہندوؤں کو قتل کیا جاسکے۔ اس لئے انہیں ذلیل وخوار تو رکھا جا سکتا ہے، مگر قتل نہیں کیا جاسکتا ہے۔ اس پر یہ علماء خاموش ہو کر چلے گئے۔

اکبر کو جب اپنی چار سے زیادہ شادیوں کو جائز قرار دینے کا سوال پیدا ہوا تو علماء نے ان کے جواز پر فتویٰ دے کر اس کی مشکل کو حل کر دیا۔

اس لئے ہم دیکھتے ہیں کہ اسلام میں ریاست نے مذہب کو یہ موقع نہیں دیا کہ وہ اس پر تسلط جما سکے، بلکہ اس نے ریاست کے مفادات کو پورا کیا، اور حکمرانوں کی خواہشات کو فتوے دے کر مذہبی طور پر انہیں جائز قرار دیا۔

جدید دور میں جب کہ جمہوری نظام آ چکا ہے، اس میں ہر شہری کو برابر کے حقوق حاصل ہیں، لہٰذا ریاست کی نظر میں اس کا شہری چاہے اس کا کوئی مذہب اور عقیدہ ہو، اس کی نظر میں ایک ہے۔ یہ ریاست کا مذہبی معاملہ میں غیر جانبدارانہ کردار ہے، جس کی وجہ سے لوگ اس کے وفادار ہوتے ہیں، اور ریاست اپنی آزادی اور خود مختاری کو برقرار رکھتی ہے۔

عدل

مسلمانوں میں جب بادشاہت کے ادارے کوتسلیم کر لیا، تو سربراہِ مملکت کو بے پناہ اختیارات مل گئے۔ خاص طور سے عباسی انقلاب نے خلیفہ کی حیثیت کو ایرانی بادشاہ کے ماڈل پر شان وشوکت، دربار کے آداب اور شاہی خزانہ کے اخراجات، یہ تمام اس کی ذات کو ممتاز کرنے کے لئے استعمال ہونے لگے۔ عباسی دربار میں جو ایرانی صاحبِ اقتدار تھے، انہوں نے عباسی خلیفہ کو ایرانی بادشاہ کی صورت میں بدل کر اس کو مطلق العنان بنادیا۔ یہی وہ ماڈل تھا جو آگے چل کر دوسرے مسلمان بادشاہوں نے اختیار کیا اور خود کو ظل الٰہی یا خدا کا سایہ قرار دے کر اپنا رشتہ عوام سے توڑ لیا، اور اپنے اختیارات کو الٰہی شکل دیدی۔

اس صورتِ حال میں مسلمان مفکرین اور دانشوروں نے، بادشاہ یا سلطان کے اختیارات کو قابو رکھنے کے لئے پند ونصیحت کے طریقوں کو استعمال کرنا شروع کیا۔ اس سلسلہ میں انہوں نے خاص طور سے ایران کے قدیم بادشاہوں کی روایات کو دوبارہ سے زندہ کیا، اور ان کے کردار کو ابھارا، جس میں ان کی رعیت پروری، عوام کی فلاح و بہبود کے اقدامات کا ذکر کیا اور خاص طور سے عدل وانصاف کے بارے میں موثر انداز میں لکھا کہ سلطنت کی خوش حالی اور امن وامان کی وجہ ان کا عدل تھا۔ عدل کے سلسلہ میں ایران کے بادشاہ نوشیرواں کو بطور مثال پیش کیا گیا کہ جس کے عدل وانصاف کے قصے تاریخ میں مشہور تھے، اور مسلمان بادشاہوں کو نصیحت کی گئی کہ اس کے ماڈل کو اختیار کرتے ہوئے عدل کو اختیار کریں۔ تاکہ رعیت ظلم وستم سے محفوظ رہے۔ اس پند ونصیحت کا نتیجہ یہ تھا کہ مسلمان بادشاہ خصوصیت سے ''بادشاہ مامون'' کا خطاب بطور فخر اختیار کرتے تھے اور دربار کے مورخ بھی ان کے عدل وانصاف کے واقعات کو بیان کر کے ان کے کردار کی تعریف وتوصیف کرتے تھے۔

بادشاہوں کے بطور ہدایت اس قسم کا ادب لکھا گیا کہ جس میں تاریخ کے سچے اور من گھڑت واقعات کو بیان کر کے اس بات کی کوشش کی گئی کہ وہ اپنے اختیارات کا بے جا استعمال نہ کریں، اور اپنی حکومت کو عوام کی فلاح کے لئے استعمال کریں۔ اس مقصد کے لئے جو چند اہم کتابیں لکھی گئیں ان میں کیکاؤس کی قابوس نامہ، نظام الملک کا سیاست نامہ اور غزالی کی نصیحت الملوک قابلِ ذکر ہیں۔

ہندوستان میں ضیاء الدین برنی جو عہد تغلق کا مورخ تھا، اس نے فتاویٰ جہانداری کتاب لکھی، اس میں اس نے جہاں مملکت کے اصول وضوابط کا ذکر کیا ہے، وہیں خاص طور سے عدل کے بارے میں یا تغلق کے عہد کا برنی کہتا ہے۔ عدل ایک ایسی ترازو کی مانند ہے کہ جس کے ذریعہ اچھائی اور برائی کو تولا اور جانچا جا سکتا ہے۔ عدل صحیح اور غلط دعوؤں کے درمیان تمیز کرتا ہے۔ اس کے اپنے الفاظ میں ''عدل ظلم، تشدد، زبردستی، غبن اور لوٹ مار کو فاش کر دیتا ہے۔ لہٰذا عدل کے بغیر لوگوں کے معاملات میں استحکام نہیں ہو سکتا ہے۔''

عدل کی تعریف کرتے ہوئے وہ مزید لکھتا ہے کہ: ''ایک طاقت ور اور مقتدر حکمراں کو عوام میں عدل قائم کرنا چاہئے۔ کیونکہ اگر اس سرزمین کے تمام دانشمند با اختیار مصنّفین کے بغیر ہی محض پالیسی یا عقل کے فرمان کے ذریعہ کسی دیہات یا مکان کو چلائیں گے تو انہیں کامیابی نہیں ہوگی۔ عدل معاشرتی منتظم اور شہری نظم کی بنیاد ہے، اور عوام میں مضبوط حکمراں اسے انجام دیتا ہے۔ عدل قائم کرنے کی ضرورت ہی سلطانوں کی برتری اور ان کے اختیارات اور عزت کا صحیح جواز ہے اپنے شاہی اختیارات اور جاہ وجلال سے ہی سلطان طاقت وروں کو عوام کے ساتھ اپنے لین دین میں زیادتی کرنے سے روک سکتا ہے۔

برنی اور دوسرے مفکرین وعلماء عدل کی اہمیت پر اس وجہ سے زور دیتے رہے ہیں کیونکہ اس کی وجہ سے کمزور اور ناتواں، غریب اور محروم لوگوں کے حقوق کا تحفظ ہو سکے گا۔ ورنہ طاقت ور لوگ ناتواں اور بے بس لوگوں کی زندگی اجیرن کر دیں گے۔

قدیم زمانے میں عدل کا تصور بادشاہ اور حکمراں کی ذات سے تھا، اور عوام بادشاہ عادل کی سرپرستی میں خود کو محفوظ خیال کرتے تھے۔ موجودہ جمہوری زمانے میں اب بادشاہت اور مطلق العنان حکومتیں نہیں رہیں اور عدل اب عدلیہ کے ماتحت ہو گیا ہے کہ جہاں لوگ اپنے مقدمے لے

کر جاتے ہیں اور توقع کرتے ہیں کہ عدالتوں سے انہیں انصاف ملے گا۔ بدقسمتی سے ہمارے معاشرے میں عدل اور عدالت دونوں متضاد تصورات کے طور پر ابھرے ہیں۔ عدالتوں سے عدل کا حصول اکثر ایک ناممکن امر نظر آتا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مقدمات کا طریقہ کار اس قدر پیچیدہ ہے اور قانون کی اس قدر وضاحتیں ہیں کہ لوگ عدل کے حصول کے لئے اپنی تمام عمر گنواں دیتے ہیں۔

ان عدالتوں کے علاوہ قبائلی اور جاگیردار معاشرے میں پنچایت، اور جرگے ہیں کہ جو انصاف اور عدل کے ادارے بنے ہوئے ہیں، لیکن جیسا کہ اطلاعات ہیں، ان اداروں میں جاگیرداراور قبائلی سرداروں کے فیصلے پر عمل ہوتا ہے۔ غریب لوگ ان کے ظلم و تشدد کی وجہ سے ان فیصلوں کو ماننے پر مجبور ہوتے ہیں۔

چونکہ ہمارا معاشرہ طبقاتی ہے، جس میں اشرافیہ کے پاس اقتدار، دولت اور اختیارات ہیں، اس لئے یہ خود کو قانون سے بالاتر سمجھتے ہیں، اور قانون کی خلاف ورزی کو باعث فخر گردانتے ہیں۔

اس لئے قدیم مفکرین نے عدل کے بارے میں جن خیالات کا اظہار کیا ہے، اگر دیکھا جائے تو ہمارے معاشرے میں اس کی کمی اور اس پر عمل نہ ہونے کی صورت میں طاقت ور کمزور پر غالب ہے اور دولت مند غریب کو کچلے ہوئے ہے۔ قانون ساز ادارے اہل اقتدار کے مفادات کا تحفظ کرتے ہیں اور کمزور غریب لوگ عدل کے حصول کے لئے مارے مارے پھرتے ہیں۔ ایک ایسا معاشرہ کہ جہاں لوگوں کو انصاف نہ ملے، وہ انتشار، بےیقینی، مایوسی اور بےبسی کا مظہر بن جاتا ہے اور پھر کچھ افراد عدل کے حصول سے مایوس ہو کر تشدد کی راہ کو اختیار کرتے ہیں اور معاشرے میں ایسی مافیائیں پیدا ہو جاتی ہیں کہ جو پیسہ لے کر لوگوں کو انصاف مہیا کرنے کا دعویٰ کرتی ہیں، اس صورت حال میں ریاست اور حکومت محض برائے نام رہ جاتی ہیں، اور لوگوں کو ان پر سے اعتبار اٹھ جاتا ہے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہمارا معاشرہ ایک ایسی ہی صورت حال سے دوچار ہے۔

سیاستداں

سیاست بطور ایک علم اور ہنر، اس وقت اپنی پختگی کو پہنچی کہ جب ریاست کا ادارہ وجود میں آیا، اوراس کے مختلف پہلو ضرورت کے تحت سامنے آتے چلے گئے کہ ان کے ذریعہ ملک میں نظم و ضبط کو برقرار رکھا جائے۔ ریاست کی ضرورت کے تحت مفکروں اور دانشوروں نے سیاست کے اصول اور ضوابط پر کتابیں لکھیں۔لیکن بادشاہت اور آمریت کے عہدوں میں سیاست دربار اور اس کے اردگرد کے دائروں میں محدود تھی۔ اکثر اس کو سازش اور جوڑ توڑ کا نام بھی دیا جاتا تھا۔عوام اس سیاست سے دور تھے۔ جو افراد سیاست میں ملوث ہوتے تھے، ان کے ذاتی اغراض و مقاصد تھے کہ اس کے ذریعہ وہ ان کو پورا کرنا چاہتے تھے۔مقصد یہ ہوتا تھا کہ بادشاہ یا امراء سے ایک خوشگوار تعلقات رکھے جائیں اوران کی خوشنودی کے نتیجہ میں کیسے فوائد حاصل کئے جائیں۔

سیاستدانوں کا یہ طبقہ جس سے ہم آج واقف ہیں۔ اس کا سب سے پہلے وجود یونان کی شہری ریاستوں میں ہوا کہ جہاں جمہوری نظام کا قیام عمل میں آیا۔ کیا اس نظام میں فیصلہ کا حق عوام کو دیا گیا، تو سیاستدانوں کا تعلق عوام سے ہوا، کہ کس طرح ان کو اپنے موقف سے آگاہ کر کے ان کی رائے کو اپنے حق میں ہموار کیا جائے۔ اس لئے ایتھنز کی جمہوریت میں سیاستدانوں کی اہمیت ابھری، اوراس پر بحث ہوئی کہ ان کا کردار کس قسم کا ہونا چاہئے، اورعوام سے ربط وضبط اور تعلقات میں ان کا کیا رویہ ہونا چاہئے؟

افلاطون نے اپنی کتاب ''ریپبلک'' میں جہاں سقراط کے ڈائیلاگ دیئے ہیں، وہاں اس نے سیاستدانوں کے بارے میں اس کی رائے کا بھی ذکر کیا ہے۔ وہ ان کے بارے میں کہتا ہے کہ سیاستدانوں کو ڈاکٹروں کی مانند ہونا چاہئے۔جس طرح ڈاکٹر کا تعلق اپنے مریض سے گہری ہمدردی اور انسانی جذبات کے ساتھ ہوتا ہے اوراس کی کوشش ہوتی ہے کہ وہ اس کے مرض کا علاج

دریافت کرے اور اسے صحت یاب کرائے، اور اس کا وہ عہد کہ جو بقراط نے ڈاکٹروں کے لئے لازمی قرار دیا ہے کہ وہ مریض کو نقصان نہیں پہنچائیں گے۔ اس ماڈل پر سیاستدانوں کی تربیت ہونی چاہئے۔ ان کا تعلق بھی عوام سے دوستانہ اور ہمدردانہ ہونا چاہئے، اور مقصد یہ ہونا چاہئے کہ ان کے مسائل کو حل کیا جائے، ان کی زندگی کو خوشگوار بنایا جائے۔

افلاطون اپنی کتاب ریپبلک میں ایک طرف تو جمہوریت پر تنقید کرتا ہے، جو اس کے نزدیک ایسا نظام حکومت ہے کہ جس میں انتشار اور افراتفری ہوتی ہے، اور جو انصاف کے اصول کی خلاف ورزی کرتا ہے۔ وہ اس لئے اس پر تنقید کرتا ہے کیونکہ اس کے استاد سقراط کو اس نظام میں سزائے موت دی گئی تھی، اور وہ اس نظام میں سیاستدانوں پر بھی تنقید کرتا ہے جو اپنی خطابت، لفاظی، خوش بیانی اور وہی اداؤں کے ذریعہ لوگوں کو اپنے موقف پر قائل کرتے ہیں۔ دوسرے ان سیاستدانوں کے نزدیک سب سے اہم مسئلہ یہ ہوتا ہے کہ وہ لوگوں میں مقبولیت حاصل کریں۔ اس کی خاطر وہ ان باتوں کا ذکر کرتے ہیں کہ جو لوگوں کو خوش کریں۔ وہ اس سے گریز کرتے ہیں یا دور رہتے ہیں کہ جو اگرچہ وقتی طور پر لوگوں کو پسند نہ آئیں، مگر وہ منصوبے قوم اور ملک کے لئے فائدہ مند ہوں گے۔ اس سلسلہ میں اپنے نظریات اور افکار کی وضاحت نہیں کرتے ہیں، اس کی وجہ سے ان کی تقریروں اور باتوں میں سطحیت آتی ہے اور فکر کی گہرائی ختم ہو جاتی ہے۔ تیسرے یہ کہ وہ لوگوں کے سامنے ایسے منصوبے پیش کرتے ہیں کہ جو وقتی ہوتے ہیں، کیونکہ وہ ان منصوبوں کے ذریعہ وقتی طور پر اقتدار حاصل کرنا چاہتے ہیں اور ایسے منصوبوں سے کتراتے ہیں کہ جن کے عمل درآمد پر زیادہ وقت لگتا ہے۔ افلاطون نے جن بنیادوں پر سیاستدانوں کی مخالفت کرتے ہوئے ان پر اعتراضات کئے ہیں یہ آج بھی درست اور صحیح ہیں۔ ہم دیکھتے ہیں کہ الیکشن کے وقت سیاستداں ایک دوسرے کی ذات پر حملے کرتے ہیں ان کی کمزوریوں پر روشنی ڈالتے ہیں، اور بہت کم مثبت رویہ اختیار کرتے ہوئے سنجیدہ اور اہم مسائل پر عوام سے گفتگو نہیں کرتے ہیں۔

موجودہ سیاستداں، جمہوریت کے ارتقاء اور اس کی ترقی اور پھیلاؤ کے نتیجہ میں وجود میں آئے۔ جب سیاسی جماعتوں کا قیام عمل میں آیا، تو یہ جماعتیں نظریاتی بنیادوں پر قائم ہوئیں ان میں قدامت پرست، ترقی پسند، ابتداء میں دو قسم کے رجحانات کی عکاسی کرتی تھیں۔ آگے چل کر جب سیاسی نظریات وجود میں آئے تو یہ سیاسی جماعتیں بھی قوم پرست، فرقہ پرست، لبرل

سوشلسٹ، کمیونسٹ، اور مذہبی نظریات کے تحت تقسیم ہوگئیں، اس کے ساتھ ہی سیاستداں بھی ان نظریات کے تحت ان جماعتوں سے جڑ گئے، اور مقصد یہ ٹھہرا کہ اپنے نظریات کی تبلیغ کر کے، لوگوں کو اپنا حامی بنا کر اقتدار حاصل کیا جائے، اور پھر ان نظریات کے تحت سوسائٹی کی تشکیل کی جائے۔ اس لئے اب سیاستداں، سیاسی جماعتوں کے موقف کی نمائندگی کرتے ہوئے اپنا کردار ادا کرتے ہیں۔ اس مقصد کے لئے یہ جدید دور کے تمام تقاضوں کو پورا کرتے ہیں، اور لوگوں میں اپنے موقف کی حمایت میں ذرائع ابلاغ کو استعمال کرتے ہیں، سوسائٹی میں موجود مختلف گروپوں، برادریوں اور افراد کو اپنے نظریہ کی حمایت میں دلائل اور انفارمیشن کے ذریعہ اپنا حامی بناتے ہیں۔ ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ عوام کے ووٹوں کو حاصل کرنے کے لئے ہر ممکن طریقہ اور ذریعہ کو استعمال کیا جائے اور اقتدار میں آیا جائے۔

پاکستان کے سیاستدانوں کی صورت حال اور بھی مختلف ہے۔ اگر چہ یہاں سیاسی جماعتیں ہیں جو اس بات کا دعویٰ کرتی ہیں کہ وہ ایک خاص نظریہ کی حامی ہیں، مگر سیاستداں اپنے عمل اور کردار سے کسی خاص نظریہ کے پابند نظر نہیں آتے ہیں۔ ان میں سے اکثر کی یہ کوشش ہوتی ہے کہ وہ مقبول اور جیتنے والی جماعت میں شریک ہوں، اس لئے الیکشن کے وقت فضا کو دیکھتے ہوئے ان سیاستدانوں کی نقل وحرکت بڑھ جاتی ہے، اور یہ جیتنے والی جماعت میں بڑے خلوص سے شرکت کرتے نظر آتے ہیں، اس لئے پاکستانی سیاستدانوں کے بارے میں یہ کہنا مشکل ہے کہ وہ کسی ایک خاص نظریہ پر یقین رکھتے ہیں۔

چونکہ اکثر سیاستداں، جاگیردار اور قبائلی سرداروں کے گروپ سے تعلق رکھتے ہیں۔ اس لئے ان کا موقف ہوتا ہے کہ ان کے پیروکار انہیں ووٹ اس لئے نہ دیں کہ ان کے نظریات کیا ہیں بلکہ اس لئے دیں کہ ان کا تعلق جاگیردارانہ، روحانی اور سردار کے خاندان سے ہے، اس لئے ان کے اور ووٹروں کے درمیان رشتہ، اعلیٰ اور کم تر کا ہوتا ہے، اور وہ اس کے پابند نہیں ہوتے ہیں کہ اقتدار میں آنے کے بعد لوگوں کے مسائل کو حل کریں، بلکہ الیکشن کے بعد ان کا اپنے حلقہ کے لوگوں سے رابطہ بھی ختم ہو جاتا ہے۔

سیاستدانوں میں اکثر اپنی سماجی حیثیت کی وجہ سے منتخب تو ہو جاتے ہیں مگر پارلیمنٹ میں انہیں تقریر کرنے اور اپنی بات کہنے کا سلیقہ بھی نہیں ہوتا ہے، اور اپنے اقتدار کے دوران ان کی

کوشش ہوتی ہے کہ اپنے اقتدار سے فائدہ اٹھا کر اپنی ذات کو جس قدر فائدہ ہو وہ پہنچائیں۔ اس لئے سیاست میں بدعنوانی اور کرپشن بہت پھیل گیا ہے، اور اکثر کہا جاتا ہے کہ سیاست ایک منافع بخش بزنس ہے۔ جس میں کم خرچ کر کے زیادہ سے زیادہ منافع حاصل کیا جاسکتا ہے۔

اس وجہ سے پاکستان کی سیاست میں، سیاستدانوں کا کردار منفی طور پر ابھرتا ہے، اور عوام اس بات پر کم یقین رکھتے ہیں کہ ان لوگوں میں نہ تو اتنی ذہانت، لیاقت اور صلاحیت ہے کہ یہ لوگوں کے مسائل حل کر کے ملک اور قوم کو نئی بنیادوں پر استوار کر سکیں، اور نہ ہی ان میں عوام سے محبت ہے کہ ان کی زندگی میں تبدیلی لے کر آئیں۔ ان کا واحد مقصد اقتدار کا حصول ہوتا ہے، اور جب وہ اسے حاصل کر لیتے ہیں تو ان کی توجہ عوام، ملک اور قوم سے ہٹ کر اپنی ذات اور خاندان پر آجاتی ہے۔

سیاستدانوں کے اس کردار میں اس وقت تبدیلی ممکن ہے جب ملک سے کرپشن کا خاتمہ ہو گا، جاگیرداری، قبائلی اور سرداری نظام ٹوٹے گا، اور نئے پیشہ ور، نظریات کے حامل سیاستداں اُبھریں گے جن کا مقصد اقتدار کا حصول نہیں، بلکہ معاشرے اور قوم کی ترقی کے منصوبوں پر عمل کرنا ہوگا۔

پاکستان کے لوگوں کو ان سیاستدانوں کی آمد کا انتظار ہے۔

پاکستان میں جمہوریت کے تضادات

سلمان عابد کی کتاب ''پاکستان میں جمہوریت کے تضادات'' ہماری سیاسی تاریخ کی ایک الم ناک داستان ہے کیونکہ بار بار مارشل لاء کے قیام اور فوجی آمریتوں نے جمہوریت کے ادارے کو مضبوط نہیں ہونے دیا۔ دوسری جانب جاگیردارانہ نظام اور قبائلی سرداروں نے جمہوریت کو عوام کی پہنچ سے دور رکھا۔ اس وجہ سے نا تو پاکستان میں عوامی جمہوریت آئی اور نہ ہی لوگوں کو اس کے ثمرات ملے۔

افلاطون نے اپنی کتاب ''Republic'' میں جمہوریت پہ جو تنقید کی ہے وہ ہمارے ملک پر پوری اُترتی ہے۔ اس کے مطابق سیاسی رہنما ووٹ لینے کی خاطر لوگوں کے جذبات کو مشتعل کر کے مقبولیت حاصل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جبکہ ان کا مقصد ٹھوس منصوبوں کے ذریعے عوام کے مسائل کو حل کرنا نہیں ہوتا۔ یہی صورتحال پاکستان میں ہے کہ سیاسی رہنما اپنے بیانات کے ذریعے وعدے تو بہت کرتے ہیں مگر جب اقتدار میں آتے ہیں تو صرف اپنے مفادات کا تحفظ کرتے ہیں۔ اگرچہ ہم فوجی آمریتوں کو تنقید کا نشانہ تو بناتے ہیں مگر یہ دیکھنے کی ضرورت ہے کہ آخر فوجی حکومتیں کیوں قائم ہوتی ہیں اور لوگ انہیں کیوں خوش آمدید کہتے ہیں۔ عام طور سے یہ کہا جاتا ہے کہ فوجی حکومتیں بیرونی سازش کے نتیجے میں اقتدار حاصل کرتی ہیں۔ لیکن اس کا تجزیہ نہیں کیا جاتا کہ ملک کے سیاسی اور معاشی حالات کو خراب کرنے میں سیاستدانوں کا بڑا حصہ ہوتا ہے۔ جو اپنی بدعنوانیوں، کرپشن اور اقربا پروری کے ذریعے پورے نظام کو اُلٹ کر رکھ دیتے ہیں اسی وجہ سے فوجی آمروں کو یہ موقع ملتا ہے کہ وہ ملک کی خرابیوں کا ذمہ دار سیاستدانوں کو ٹھہرا کر اقتدار پر قابض ہو جائیں۔ پاکستان میں جمہوریت کی ناکامی کی وجہ یہاں پر جاگیرداروں، قبائلی سرداروں اور سرمایہ داروں کا قبضہ ہے۔ ملک کی تمام بڑی جماعتیں ان کی جاگیریں ہیں۔ ان جماعتوں پر ان کے خاندانوں کا قبضہ ہے۔ اس کی وجہ سے متوسط طبقے کے افراد کو اس کا موقعہ نہیں ملتا کہ وہ سیاست میں کوئی مقام

حاصل کرسکیں۔ وہ صرف اس صورت میں سیاسی طور پرآ گے بڑھ سکتے ہیں جبکہ وہ پارٹی کے رہنماؤں سے اپنی وفاداری کا مکمل اظہار کریں، کیونکہ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان سیاسی جماعتوں میں نا تو الیکشن ہوتے ہیں، اور نہ ہی خاندانی لیڈرشپ جوان پر قابض ہے۔ اس میں کوئی تبدیلی آتی ہے۔ جب جمہوریت کو سیاسی خاندانوں میں بند کردیا جائے اور متوسط یا نچلے طبقوں کو ان کی ذہانت کے باوجود آ گے نہیں بڑھنے دیا جائے تو اس صورت میں جمہوریت کھوکھلی ہوجاتی ہے۔

ایک اہم وجہ جمہوریت کی خرابی کی یہ ہے کہ سیاسی جماعتوں کی بنیاد کسی نظریئے پرنہیں ہوتی جیسا کہ دوسرے جمہوری ملکوں میں ہوتا ہے۔ جہاں قدامت پسند لبرل اور بائیں بازو کے نظریات رکھنے والی جماعتیں ہوتی ہیں۔لیکن پاکستان کی بڑی سیاسی جماعتیں کسی خاص نظریئے کی حامی نہیں سوائے اس کے کہ وہ اقتدار میں آ کر ہر قسم کی تبدیلی کو روک دیں، اور ریاستی اداروں کو اپنے اقتدار کے استحکام کے لئے استعمال کریں۔

انتخابات اگرچہ جمہوریت کا اہم حصہ ہوتے ہیں جو عوام کو بار بار متحرک رکھتے ہیں کہ وہ اپنی پسند کی جماعت یا افراد کو منتخب کریں مگر پاکستان کے معاشرے میں شہروں کو چھوڑ کر دیہاتی علاقوں میں جاگیرداروں اور قبائلی سرداروں کا اتنا اثر و رسوخ ہے کہ وہ کسی بھی جماعت میں ہوں لوگ انہیں ووٹ دے کر کامیاب بناتے ہیں۔ اس لئے ہم کہہ سکتے ہیں کہ جیتنے والے امیدوار اور ان کے قیدی ووٹرز جمہوریت کی راہ میں رکاوٹ ہیں۔

اکثر یہ کہا جاتا ہے کہ پاکستان میں مذہبی جماعتیں الیکشن میں کامیاب نہیں ہوتیں اس کی دو وجوہات میں ایک تو ملک کی تمام بڑی جماعتیں اور اُن کے منشور اتنے مذہبی ہوگئے ہیں کہ ان میں اور مذہبی جماعتوں میں کوئی فرق نہیں رہا۔ مگر دوسرے مذہبی جماعتوں میں جیتنے والے جاگیردار اور قبائلی سردار نہیں ہیں ان جماعتوں کا اثر ورسوخ شہروں کے متوسط طبقے تک محدود ہے۔ پاکستان کی سیاسی تاریخ میں جو کردار طالب علموں، ٹریڈ یونینز کے لیڈروں اور دانش وروں کا تھا وہ تقریباً ختم ہو چکا ہے۔ جمہوریت کو صرف سیاست تک محدود نہیں رکھنا چاہئے بلکہ اس کو روزمرہ کی زندگی میں استعمال کرنا چاہئے کہ جہاں لوگوں کو اظہار کی آزادی ہو اور رواداری کے جذبات ہوں۔

سلمان عابد نے اپنی کتاب ''پاکستان میں جمہوریت کے تضادات'' میں ان مختلف تضادات کی طرف اشارہ کیا ہے جن کی وجہ سے پاکستان میں جمہوری ادارے اور روایات مضبوط نہیں ہو سکے۔

پاکستان کی سیاست میں ایک اہم تبدیلی اس وقت آئی جب ریاستی اداروں کی کمزوری کی وجہ سے جرائم پیشہ افراد اور مختلف مافیاؤں کا اُبھار ہوا یہ وہ لوگ تھے جو زمینوں پر قبضہ کر کے، اسمگلنگ اور ڈرگ کے کاروبار کر کے ہفتوں اور مہینوں میں انتہائی دولت مند ہو گئے۔ اپنی دولت اور مفادات کے تحفظ کے لئے انہوں نے سیاست میں حصہ لے کر سیاسی رہنماؤں کی سرپرستی کی۔ یہی وجہ ہے کہ سیاست میں کرپشن اور بدعنوانیوں کے نتیجے میں بہت پیسہ آیا۔ اس کی مثال موجودہ الیکشن ہیں کہ جن میں پیسے کو استعمال کر کے عوام کے ووٹوں کو حاصل کیا گیا۔

اس لئے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا پاکستان میں جمہوری نظام اور جمہوری ادارے اور روایات مستحکم ہو سکیں گے یا نہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ جمہوریت اس وقت تک اپنی جڑیں مضبوط نہیں کر سکے گی جب تک یہاں سے جاگیرداری کا خاتمہ نہیں ہو گا اور تعلیم کو عام نہیں کیا جائے گا۔ ہم جمہوریت میں عوام کے کردار کو صرف ووٹ دینے تک محدود کر دیتے ہیں جب کوئی بھی جماعت اقتدار میں آ جاتی ہے تو پھر عوامی احتجاج اور مزاحمت ان کے لئے بغاوت کے مانند ہوتی ہے۔ جیسے وہ پولیس رینجرز اور فوج کے ذریعے ختم کرنے کی کوشش کرتی ہے۔ ہمارے ملک میں عوامی احتجاج کو حکومتیں برداشت کرنے پر تیار نہیں ہوتیں۔ اس لئے جب تک جمہوریت میں عوام کا بھرپور کردار نہیں ہو گا یہ جاگیرداروں اور قبائلی سرداروں کے ذریعے خود کو فوجی آمروں سے نہیں بچا سکے گی۔

اس کی مثال جنوبی امریکا کا ملک ''Vanizola'' وینی زولا کہ جہاں عوامی مزاحمت نے فوجی آمروں کو اقتدار میں نہیں آنے دیا۔

سلمان عابد کی یہ کتاب کئی سوالات کو پیدا کرتی ہے اور اس پر روشنی ڈالتی ہے کہ آخر پاکستان میں جمہوریت کیوں ناکام ہوئی اور اس کے اندرونی تضادات نے اس کو کیا نقصان پہنچایا۔ اس کتاب کے آخر میں بے نظیر بھٹو اور نواز شریف کی حکومتوں کو ختم کرنے اعلامیے صدر اسحاق خان اور صدر فاروق لغاری نے جاری کئے تھے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ان بیانات میں جو الزامات لگائے گئے ہیں انہی کو بار بار دھرایا گیا ہے۔

پیپلز پارٹی کی پچھلی حکومت نے عوام کو فوج سے ڈرا کر اپنے 5 سال پورے کر لئے اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ نئی حکومت کیا لوگوں کو فوجی آمریت سے خوف زدہ کر کے حکومت کرے گی یا عوامی مسائل حل کر کے عوام کی مدد سے پانچ سال پورے کرے گی۔

تبدیلی

مورخ اور ماہر آثارِ قدیمہ انسانی تاریخ کے مطالعہ کے بعد، اس پر تحقیق کر رہے ہیں کہ انسانی معاشروں میں تبدیلی کیوں آتی ہے؟ کیا یہ تبدیلی اندرونی دباؤ کا نتیجہ ہوتی ہے یا اس میں بیرونی عوامل کا دخل ہوتا ہے؟ کیا تبدیلی ترقی کا باعث بنتی ہے یا یہ ایک مستحکم اور پائیدار معاشرے کے امن وامان کو برباد کر کے اسے بحران میں مبتلا کر دیتی ہے؟ اس پر تو سب متفق ہیں کہ بہر حال انسانی معاشرہ ایک جگہ ٹھہرا ہوا نہیں رہتا ہے، بلکہ اس میں برابر تبدیلی آتی رہتی ہے، ہر دور اور عہد دوسرے سے مختلف ہوتا ہے۔ ہر آنے والی نسل اپنے ساتھ نئے خیالات ونظریات لے کر آتی ہے، جو معاشرے کے کلچر کو برابر متحرک رکھتا ہے۔

تبدیلی کے بارے میں ایک نقطۂ نظر تو یہ ہے کہ یہ اندرونی طور پر معاشرے کے اپنے دباؤ، اور حالات کے تحت آتی ہے۔ مثلاً جب انسان شکار اور غذا جمع کرنے کے دور سے نکل کر زراعتی دور میں آیا، تو اس کے آلات، اوزار اور روزمرہ زندگی کے معمولات بدل گئے، اس کی غذا میں تبدیلی آئی، ایک جگہ رہنے کی وجہ سے برادری اور تعاون کا ماحول پیدا ہوا اور جب آبادی بڑھی، اور اس کے لئے زیادہ پیداوار کی ضرورت ہوئی تو اس نے ٹیکنالوجی میں ایجادات کو فروغ دیا۔ پتھر کے اوزار، پہلے کانسی اور بعد میں لوہے میں بدل گئے۔ ہل کی شکل اور ہوگئی، کہ جس کی وجہ سے پیداوار میں اضافہ ہوا۔ اس لئے مورخ اور ماہر آثارِ قدیمہ کے ماہرین کا استدلال ہے کہ اندرونی تقاضے اور ضروریات ٹیکنالوجی میں ایجاد کا باعث ہوئیں کہ جن کی وجہ سے معاشرہ کا سماجی ڈھانچہ بدل گیا۔

مثلاً مورخ یہ اشارہ کرتے ہیں کہ ہندوستان میں ٹیکنالوجی میں زیادہ ایجادات اس لئے نہیں ہوئیں کہ یہاں آبادی بہت زیادہ تھی، جو ہر کام کے لئے تیار تھی، اس لئے انسانی محنت کی

جگہ ٹیکنالوجی نے نہیں لی۔ جب کہ ان معاشروں میں جہاں آبادی کم تھی، وہاں انسانی محنت کی جگہ مشینوں نے لے لی تا کہ اس کمی کو پورا کیا جا سکے۔

دوسرے نقطہء نظر میں تبدیلی بیرونی عوامل کے نتیجہ میں بھی آتی ہے۔ مثلاً اگر دوسری قوم کے لوگ حملہ آور ہوں، اور ملک پر قبضہ کر لیں، تو یہ اپنے ساتھ اپنی ایجادات، نظریات اور کلچر لے کر آتے ہیں، جو فاتح کی حیثیت سے مفتوح معاشرے پر غالب آ جاتا ہے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ فاتح اگر تہذیبی طور پر مفتوح کے مقابلہ میں پس ماندہ ہو، تو اس صورت میں اس کا کلچر فاتح پر غالب آ جاتا ہے۔ لیکن ہر صورت میں قوموں کے میلاپ سے معاشرے میں تبدیلی آتی ہے۔

اس تبدیلی میں تاجروں کا بھی کردار اہم ہوتا ہے۔ قدیم زمانہ سے لے کر آج تک تاجر نہ صرف اشیاء کا تبادلہ کرتے ہیں بلکہ یہ دوسرے ملکوں اور قوموں کے نظریات و افکار اور ان کے کلچر کو بھی اپنے معاشرے میں روشناس کراتے ہیں۔

تاریخ کے مطالعہ سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ ٹیکنالوجی میں جو ایجادات ہوتی ہیں چاہے وہ معاشرے اور ملک میں ہوں، وہ اپنے فائدے کے مدنظر ایک جگہ رکی ہوئی نہیں رہتی ہے، بلکہ آہستہ آہستہ دوسرے معاشروں میں بھی پھیل جاتی ہے اور ان کی زندگی کا ایک حصہ بن جاتی ہے۔ قدیم زمانے میں بھی جب کہ ملکوں اور قوموں کے روابط کم تھے، ذرائع نقل و حمل کی مشکلات تھیں، مگر اس کے باوجود مفید اور اہم ایجادات پوری دنیا میں پھیل گئیں، جیسے پہیہ کا استعمال، یا گھوڑے کو قابو میں رکھنے کے لئے باگ دوڑ وغیرہ۔

تبدیلی کے اثرات کے پیش نظر کہا جاتا ہے کہ کسی بھی معاشرے میں روایات و اقدار اور اداروں کا مستحکم ہونا، یا پائیدار ہونا مشکل ہوتا ہے۔ کیونکہ جس قدر یہ مضبوط ہوں گے اسی قدر ان معاشروں میں تبدیلی کا عمل مشکل اور سست ہوگا۔ کیونکہ جب ادارے اور روایات مستحکم شکل اختیار کر لیتی ہیں تو وہ طبقے جو ان سے فائدہ اُٹھاتے ہیں اور جن کے مفادات ان سے جڑ جاتے ہیں، وہ تبدیلی کے سخت مخالف ہوتے ہیں، کیونکہ وہ ان کے مفادات کو نقصان پہنچا کہ اس کی برتری کو ختم کر دے گی۔ جب کہ محروم طبقے کہ جنہیں ان اداروں اور روایات سے کوئی فائدہ نہیں ہے وہ ان کے خاتمہ کے لئے کوشاں ہوتے ہیں، کیونکہ تبدیلی ان کی زندگی میں انقلاب لائے گی۔

تبدیلی کے سلسلہ میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ جب کسی بھی معاشرے میں ادارے،

اقدار، اور رویئے ایک خاص مدت پر بغیر کسی تبدیلی اور چیلنج کے قائم رہیں تو لوگ انہیں فطری یا نیچرل سمجھنے لگتے ہیں، اوراس پر یقین رکھتے ہیں کہ ان کی تبدیلی کے نتیجہ میں معاشرہ بحران میں مبتلا ہو جائے گا۔ وہ اس ماحول کے اس قدر عادی ہو جاتے ہیں کہ انہیں اسی حالت میں برقرار رکھنا چاہتے ہیں، چاہے وہ ان کے لئے نقصان دہ ہی کیوں نہ ہوں، اس صورت میں تبدیلی ایک اذیت ناک عمل بن جاتا ہے اور لوگ نئے ماحول میں خود کو اجنبی محسوس کرنے لگتے ہیں، اس لئے لوگوں کو ذہنی طور پر تبدیلی کے لئے تیار کرنا مشکل امر ہوتا ہے۔

تاریخ یہ بتاتی ہے کہ کوئی ادارہ یا روایت آفاقی نہیں ہوتی ہے۔ یہ وقت کی پیداوار ہوتی ہے اور جب اس کی افادیت ختم ہو جائے، تو اسے تبدیل کر کے اس کی جگہ نئے اداروں اور روایات کو تشکیل کرنا چاہئے۔

تبدیلی کا عمل یہ بھی ظاہر کرتا ہے کہ انسان میں جو تخلیقی صلاحیتیں اور قوتیں ہیں، وہ برابر سرگرم عمل رہتی ہیں۔ اس لئے جو معاشرے تبدیلی کے عمل میں ان تخلیقی قوتوں کو ابھارتے ہیں، ان میں برابر نئی ایجادات ہوتی رہتی ہیں، اور وہ وقت کے تقاضوں کے تحت اپنے خیالات واقدار بدلتے رہتے ہیں۔ یہ ان کی ترقی کی علامت ہے، مگر جو معاشرے تبدیلی سے خوف زدہ ہوتے ہیں وہ ان تخلیقی قوتوں کو کچل کر رکھ دیتے ہیں، جس کی وجہ سے معاشرہ میں پس ماندگی آ جاتی ہے اور وہ ایک جگہ جامد ہو کر رہ جاتا ہے۔

ایک زمانہ میں تبدیلی کی رفتار بہت سست تھی، مگر اب اس میں تیزی آ گئی ہے، اور ٹیکنالوجی کی ایجادات اس قدر تیزی سے آ رہی ہیں کہ کسی بھی معاشرے میں بہت جلد ان کو سمجھنا اور ان کو استعمال کرنا مشکل ہوتا جا رہا ہے۔

ٹیکنالوجی میں ایجادات کی اس رفتار کو دیکھ کر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا سرمایہ دارانہ صنعت میں مقابلہ کے اس عمل میں، اور ایجادات کی اس بھرمار کے نتیجہ میں ہم اس بوجھ کو برداشت کر سکیں گے یا نہیں۔

ایک جرمن ماہر معیشت شم پیٹر (Schum Peter) کا کہنا ہے کہ ٹیکنالوجی اور اس کی یہ ایجادات خود اس نظام میں ایک زبردست بحران پیدا کریں گی۔ اس کا یہ مشاہدہ ہم دیکھ رہے ہیں کہ کمپیوٹر، سیل فون، اور دوسری ایجادات نے معاشی اور ذہنی طور پر لوگوں کو مشکلات میں مبتلا کر دیا ہے

یعنی ہم ایک ایجاد سے پوری طرح باخبر نہیں ہوتے ہیں کہ اس سے بڑھ کر دوسری ایجاد آ جاتی ہے۔

پاکستانی معاشرہ خود تو اس ٹیکنالوجی کی ایجادات میں شامل نہیں، مگر یہ اس کے سماج کا حصہ بن رہی ہیں۔ اس لئے ایک طرف تبدیلی کا عمل ہے تو دوسری طرف اس کے مخالف۔ جاگیردارانہ اور قبائلی معاشرہ میں ٹیکنالوجی کو تو قبول کرلیا جاتا ہے مگر اس سے متعلق جو نظریات وافکار ہیں ان کو روکنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ لیکن جب یہ عمل شروع ہوگا تو پرانی اقدار، روایات اور ادارے خود کو زیادہ دیر تک قائم نہیں رکھ سکیں گے اور تبدیلی کا یہ عمل فرسودہ خیالات اور کلچر کو ختم کر دے گا۔

چوک

یونان میں شہری جمہوریتوں کے قیام کی وجہ سے عام لوگوں کی اہمیت ہوگئی تھی۔ اگرچہ ہر طرح کا حق آزاد شہریوں کو تھا۔ غلام، عورتیں اور غیر ملکیوں کو یہ حق نہیں دیا گیا تھا۔ لیکن جمہوریت کی وجہ سے عام لوگوں کی اہمیت نہ صرف سیاست، بلکہ سماجی معاملات میں بھی بڑھ گئی تھی۔ یونان کے شہروں میں عوام کے مجمعے، بحث ومباحثہ کرنے، اور کلچر کے فروغ میں حصہ لینے کے لئے، شہر میں ایک بڑا وسیع و عریض چوک تھا جسے یونانی زبان میں اگورا (Agora) کہتے تھے۔ اس چوک میں بازار بھی تھا، دفاتر بھی تھے اور تاجروں کے گودام بھی تھے۔ چوک میں جگہ جگہ پورٹیکو یا چھجہ دار عمارتیں تعمیر کی گئی تھیں۔ ان کے سایہ کے نیچے فلسفی اور دانشور بحث ومباحثہ کرتے تھے، یونانی زبان میں اسے اسٹو (Stove) کہتے تھے، اس سے اسٹوئے سیزم (Stoicism) فلسفہ نکلا کیونکہ اس کے ماننے والے یہاں بیٹھ کر فلسفیانہ امور پر بات چیت کرتے تھے، یہ فلسفی (Stoics) کہلاتے تھے۔

سقراط کا یہ معمول تھا کہ وہ روز اگورا یا چوک میں آجاتا تھا اور یہاں نوجوانوں کو پکڑ کر ان سے سوال و جواب کرتا تھا۔ اس کے اس رویہ کی وجہ سے شاید لوگ اسے دیکھ کر بھاگتے بھی ہوں کہ وہ ان سے ایسا سوال کر بیٹھے گا جس کا جواب دینے کے لئے نہ ان کے پاس وقت ہوگا اور نہ علم۔ یہ روایت بھی تھی کہ اگورا میں نابالغ لڑکے نہیں آسکتے تھے۔ عورتوں کو بالکل اجازت نہیں تھی۔ اس لئے سقراط اکثر ان نوجوانوں سے اگورا کی سرحد سے باہر ملا کرتا تھا۔ تاریخ سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ اگورا ایتھنز کے لوگوں کے لئے نہ صرف تفریح کا باعث تھا، بلکہ یہاں سنجیدہ فلسفیانہ گفتگو بھی ہوتی تھی اور ساتھ ساتھ دوکاندار اپنی تجارت میں بھی مصروف رہتے تھے۔

اگورا ہی میں ایتھنز شہر کی اسمبلی کا اجلاس ہوتا تھا، جہاں سیاست کے اہم امور طے کئے جاتے تھے، اس لحاظ سے یہ جگہ لوگوں کو ذہنی غذا مہیا کرتی تھی اور اس کی وجہ سے لوگ شہر کے امور اور جمہوریت کے معاملات میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔

وقت کے ساتھ ایتھنز شہر کا یہ تاریخی چوک عمارتوں میں گھِر کر گمنام ہو گیا تھا، مگر پچھلے برسوں میں یونان کی حکومت نے کوئی 400 گھروں کو گرا کر دوبارہ سے اس تاریخی چوک کی تاریخی حالت کو تعمیر کرایا ہے، اگر چہ اب اس چوک کو بحال کر دیا گیا، مگر اس کا سیاسی، ادبی، اور فلسفیانہ ماحول دوبارہ سے زندہ نہیں ہو سکا۔ لیکن اس کی بحالی نے ایتھنز شہر کی خوبصورتی کو بڑھایا ہے اور اسے ماضی کی تاریخ سے ملا دیا ہے۔

ایتھنز کے علاوہ یہ چوک یونان کے دوسرے شہروں میں بھی تھے، اور لوگوں کو یہ موقع فراہم کرتے تھے کہ وہ اس جگہ مل کر اپنے سماجی، معاشی، اور سیاسی معالات پر گفتگو کریں۔ اس لحاظ سے یہ چوک ایک تربیت کی جگہ تھا۔

رومی بھی اگورا کے اس ادارے اور اس کی اہمیت سے متاثر ہوئے، اس لئے روم میں انہوں نے وسیع و عریض اور کھلی جگہ اس مقصد کے لئے رکھی جسے وہ فورم (Forum) کہتے تھے۔ فورم روم کے شہریوں کے ملنے کی جگہ تھی، یہاں سیاستداں اور سینیٹرز آتے تھے اور اپنے حق میں لوگوں کی رائے کو ہموار کرنے کے لئے تقاریر کرتے تھے۔ اس مقصد کے لئے فورم میں روسٹرم ہوتا تھا کہ جس سے وہ خطاب کرتے تھے۔ اس جگہ شہر کے انتخابات ہوتے تھے، اور اس کے اردگرد کی عمارتیں انتظامیہ کے اہم دفاتر تھے، رومیوں نے اپنے قوانین کو کندہ کرا کے یہاں رکھ رکھا تھا، تاکہ ہر شہری اسے پڑھ سکے اور اس سے واقف ہو سکے۔

سیاسی سرگرمیوں کے علاوہ یہاں ثقافتی سرگرمیاں بھی ہوتی تھیں۔ جنگ جوؤں کے مقابلے ہوتے تھے، تھیٹر اور ڈرامہ ہوتا تھا، موسیقی کی محفلیں ہوتی تھیں، اور لوگ آپس میں مل کر سیاست اور سماجی معاملات پر اپنے خیالات کا اظہار کرتے تھے۔

ایک لحاظ سے یہ جگہ لوگوں کے ملنے کے لئے ہو گئی تھی، اس لئے دوسرے شہروں سے آنے والے یہاں آ کر اپنے دوستوں سے ملاقات کرتے تھے۔ اس لحاظ سے روم کی زندگی میں فورم کی بے انتہا اہمیت ہو گئی تھی۔ لوگ حکومت یا سیاستدانوں کے خلاف یہاں احتجاج بھی کرتے تھے۔ اگر مختلف گروپوں میں آپس میں لڑائی جھگڑے بھی ہو جاتے تھے۔ لیکن یہ ایک ایسی جگہ تھی کہ جہاں روم کے ہر شہری کے لئے آنا لازمی ہو گیا تھا۔ اس سے شہر کی کلچرل سرگرمیاں بڑھ گئیں تھیں۔ بعد میں رومن ایمپائر کے دوسرے شہروں میں بھی فورم بنائے جاتے تھے۔

جب شاہجہاں نے شاہ جہاں آباد یا دہلی کو نئے سرے سے تعمیر کرایا تو اس نے خاص طور سے

چوک بنوایا، جو چاندنی چوک کے نام سے آج بھی مشہور ہے۔اس چوک کی خوبصورتی، دلکشی اور رونق کے بارے میں کئی لوگوں نے لکھا ہے۔سر سیّد احمد خاں خاص طور سے آثار الصنادید میں لکھتے ہیں کہ اس چوک کے بیچ میں نہر بہشت تھی جس کے دونوں جانب سایہ دار درخت تھے۔شام کو یہاں خوب رونق ہوتی تھی، امراء، اور شہزادے تفریح کی غرض سے آتے تھے۔ چوک میں مصور بیٹھے ہوتے تھے جو اس وقت لوگوں کی تصاویر بنا کے انہیں دیدیتے تھے۔ یہاں داستان گو تھے کہ جن کے گرد لوگوں کا مجمع ہوتا تھا، نٹ اور کرتب دکھانے والے ہوتے تھے دکانوں میں ہر قسم کا مال تھا۔

یہ چوک اگر چہ آج بھی اسی نام سے اور اسی جگہ موجود ہے، مگر اب نہ تو نہر بہشت رہی ہے، نہ درخت، اور نہ وہ ماضی کی روایات، اب اس چوک میں اس قدر مجمع ہوتا ہے کہ چلنا مشکل ہے۔ وقت کے ساتھ روایات کیسے بدلتی ہیں اور جگہ نئی زندگی اور نئے روپ میں آجاتی ہے۔ اس کا اندازہ چاندنی چوک کو دیکھ کر ہوتا ہے۔

لاہور میں داراشکوہ کا چوک ایک زمانہ میں مشہور تھا، اب اس کے کوئی آثار نہیں ہیں۔ اب نام کے چوک تو ہیں، مگر ان میں نہ تو کلچرل سرگرمیاں ہیں اور نہ لوگوں کے سماجی تعلقات کو بڑھانے میں اس کا حصہ رہا ہے۔

دنیا کے کئی ملکوں میں چوک اب بھی فعال کردار ادا کر رہے ہیں، جیسے پیکنگ میں تان مان چوک یا اسکوئر کہ جہاں طلبا ئنے جمہوریت کے حق میں زبردست تاریخی مظاہرہ کیا تھا، جسے چینی حکومت نے سختی سے کچل دیا، یا حال ہی میں قاہرہ کے تحریر چوک میں لوگوں نے حسنی مبارک کے خلاف جمع ہو کر مظاہرہ کیا اور بالآخر حکومت کو مجبور کیا کہ وہ حسنی مبارک کی آمریت سے چھٹکارا پائے۔استنبول کے تقسیم چوک میں بھی لوگوں نے اردوگون کی حکومت کے خلاف مظاہرہ کیا ہے۔

ماسکو کا ریڈ چوک مشہور ہے کہ جہاں اکتوبر انقلاب کی یاد میں فوجی پریڈ ہوتی تھی، اور اب لوگ جمہوریت اور آزادی کے لئے یہاں جمع ہو کر مظاہرہ کرتے ہیں۔ پاکستان کے شہروں میں چوکوں کے نام تو رہ گئے ہیں، مگر ان کی کشادگی اور وسعت ختم ہوگئی ہے، زمین پر قبضہ کر کے یہاں پلازہ اور دکانیں بن گئی ہیں، اسلام آباد میں اب پارلیمنٹ کے سامنے لوگ مظاہرہ کرتے ہیں یا دھرنا دیتے ہیں۔

لیکن ایک روایت ان چوکوں کی غیر موجودگی میں رواج پا گئی ہے اور وہ یہ کہ اب لوگ شہر کے پریس کلب کے سامنے مظاہرہ کرتے ہیں، بھوک ہڑتال کرتے ہیں، اور دھرنا دیتے ہیں، تاکہ اخبارات ان کے مطالبات کی تشہیر کریں۔

مقابلہ

یقین کے ساتھ یہ کہنا مشکل ہے کہ مقابلہ کا وصف ابتداء سے انسانی معاشرے میں رہا ہے یا یہ وقت کے ساتھ تاریخ کے عمل کے دوران پیدا ہوا ہے؟ لیکن جب ہم مقابلہ کی بات کرتے ہیں تو یہ سوالات ضرور پیدا ہوتے ہیں کہ کیا مقابلہ معاشرے کو متحرک رکھنے کے لئے ضروری ہے؟ یا اس کی وجہ سے معاشرے میں سماجی و معاشی ناہمواری پیدا ہوتی ہے، اور یہ ناانصافی کو پیدا کرتا ہے جس کے نتیجہ میں اخلاقی اقدار ٹوٹ پھوٹ جاتی ہیں؟

مقابلہ کے سلسلے میں مفکرین اس بات کی جانب اشارہ کرتے ہیں کہ جب افراد برادری یا قبیلہ کی شکل میں رہتے تھے تو فرد کا تعلق اپنی برادری یا قبیلہ سے اس قدر جڑا ہوا ہوتا تھا کہ اس کی انفرادیت ختم ہو جاتی تھی، اور وہ اپنی برادری کے نقطہء نظر سے ہر چیز کو دیکھتا تھا۔ اس وجہ سے اس دور میں مقابلہ بازی کی جگہ اشتراک تھا، ہم آہنگی تھی، اور فرد اپنی خواہشات کو برادری کے مفادات پر قربان کر دیتا تھا۔ اس عہد میں اگر کوئی فرد برادری سے خارج ہو جاتا تھا تو اس کی اپنی کوئی انفرادی حیثیت نہیں رہتی تھی۔

یہ صورت حال اس وقت بدلی جب سرمایہ دارانہ معاشرے کی تشکیل میں اس نے برادری کے اتحاد کو توڑا، انفرادیت پر زور دیا، فرد کی اپنی شناخت اب اس پر تھی کہ اس کو معاشرے میں کس قدر مادی فوائد حاصل ہیں۔ ان مادی وسائل، اور فوائد کو حاصل کرنے کے لئے اس میں مقابلہ کا عزم پیدا ہوا، اس کی عزت، احترام، شہرت، اور سماجی رتبہ اور حیثیت کا تعین، اس کی دولت، جائیداد اور دوسروں سے مقابلہ میں کامیابی پر تھا۔ اس لئے کامیابی کے لئے اس نے تمام اخلاقی اقدار کو قربان کر دیا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں صنعت کاروں اور سرمایہ داروں کے درمیان جب ترقی اور کامیابی کے لئے مقابلہ شروع ہوا، تو انہوں نے ہر قسم کے حربوں کو استعمال کیا، سازش، جوڑ توڑ، قتل اور حریفوں کی تباہی، اس کے لئے امریکہ کے ابتدائی دور میں صنعت کاروں کے مقابلہ کی تفصیلات دیکھئے کہ کس

طرح سے راک فیلر، مورگن، کارنیگی، اور دوسرے سرمایہ کاروں نے اپنی صنعت کو آگے بڑھانے کے لئے تمام غیر اخلاقی طریقوں کا سہارا لیا۔ اپنی دولت اور جائیداد کو تحفظ دینے کے لئے انہوں نے سیاسی جماعتوں اور لیڈروں کی سرپرستی کی کہ جنہوں نے اقتدار میں آ کر قوانین کے ذریعہ ان کے منصوبوں کو پورا کرنے میں مدد دی۔ یہ صورت حال آج بھی تبدیل نہیں ہوئی ہے، بلکہ جاری ہے۔

مقابلہ کے بارے میں مفکرین کی دو رائیں ہیں۔ ایک جانب تو وہ دانشور ہیں کہ جن کا خیال ہے کہ مقابلہ فرد کی تخلیقی صلاحیتوں کو اُبھارتا ہے۔ اس کی وجہ سے معاشرے میں نئی ایجادات بھی ہوتی ہیں، اور نئے نظریات بھی جنم لیتے ہیں۔ اگر مقابلہ کا عنصر نہ ہو تو اس صورت میں افراد ذہنی طور پر مفلوج ہو جاتے ہیں، اور حالات کو تبدیل کرنے کے بجائے، انہیں اس صورت میں برقرار رکھ کر زندگی گذارنا چاہتے ہیں۔

جب کہ دوسرے نقطۂ نظر سے مقابلہ ایک بے رحم، اور ظالمانہ طرزِ عمل ہے، کیونکہ اس کے نتیجہ میں معاشرے میں وہ افراد کہ جو کمزور یا ذہنی طور پر کم تر ہوتے ہیں، ان کے لئے ترقی کرنے، یا بہتر زندگی گذارنے کے مواقع ختم ہو جاتے ہیں، جو طاقت ور ہوتے ہیں، یا ذہین ہوتے ہیں وہ اپنی برتری کو قائم کر کے دوسروں کو اپنا ماتحت بنا لیتے ہیں، جس کی وجہ سے معاشرے میں برابر کے مواقع نہیں ملتے ہیں، اور اس کی ہم آہنگی ختم ہو جاتی ہے۔

مقابلہ بازی کی اس دوڑ کے منفی اثرات پر بحث کرتے ہوئے دانشوروں کا خیال ہے کہ اس کی وجہ سے معاشرے میں ہر فرد ذہنی دباؤ کا شکار ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اس کا میابی یا ناکامی کا انحصار اس پر ہوتا ہے کہ وہ اپنے مقابلہ میں دوسروں پر فوقیت حاصل کرے، اس کے حصول کے لئے وہ اپنی تمام توانائی، صلاحیت اور ذہانت کو صرف کر دیتا ہے، جس کے نتیجہ میں اس کی زندگی ایک مرحلہ پر آ کر خستہ و شکستہ ہو کر ختم ہو جاتی ہے اور وہ اس قابل نہیں رہتا ہے کہ مزید مقابلہ کر سکے اور مقابلہ کے تسلسل کو قائم رکھ سکے۔

اس کا اثر فرد کے خاندان پر بھی ہوتا ہے کہ وہ نہ تو اپنے اہل خانہ کو وقت دیتا ہے اور نہ ہی زندگی کی مسرتوں سے، ہم کنار ہوتا ہے۔ اس کے نزدیک کامیابی کے لئے ہر چیز کو قربان کر دینا ہوتا ہے یہ ایک مایوس کن اور دل شکن عمل ہوتا ہے کہ جس کے نتیجہ میں فرد کو اس زندگی کی مسرت کے بجائے المیہ کا سامنا کرنا ہوتا ہے۔ کیونکہ مقابلہ اس کی تمام تخلیقی صلاحیتوں کو استعمال کر کے آخر

میں اسے ناکارہ بنا دیتا ہے۔

مقابلہ کی یہ فضا معاشرے میں افراد اور طبقات ہی کے درمیان نہیں ہوتی ہے، بلکہ اس کا شکار قومیں بھی ہوتی ہیں۔ جب ان میں ایک دوسرے سے آگے بڑھنے کا سلسلہ شروع ہوتا ہے تو اپنی برتری اور افضلیت کے لئے قومیں سب سے پہلے اپنی معیشت کو مستحکم کرتی ہیں اور اس سلسلہ میں وہ دوسری کمزور قوموں کا استحصال کرتی ہیں، اس کے بعد وہ اپنی فوجی طاقت کو بڑھاتی ہیں۔ نئے نئے ہتھیاروں کی ایجاد کی جاتی ہے، اور اس قوت کے سہارے دوسری قوموں پر حکومت کی جاتی ہے۔ یہی مقابلہ کا جذبہ امپیریل ازم کے جذبات کو پیدا کرتا ہے، اور دنیا کو جنگ اور خوں ریزی میں مبتلا کر دیتا ہے۔

پہلی جنگ عظیم میں یورپ کی قوموں میں یہ جذبہ عروج پر تھا، جب یہ اپنی فوجی طاقت کو ایک دوسرے سے آگے بڑھانے میں مصروف تھیں۔ بالآخر یہ پہلی جنگ عظیم کی شکل میں ظاہر ہوا جس میں یورپ کے ان ملکوں کو مقابلہ کے نتیجہ میں بھاری قیمت ادا کرنی پڑی۔ آج بھی جب دنیا میں یہ فرق موجود ہے۔ وہ ممالک جو فوجی لحاظ سے طاقت ور ہیں۔ وہ کمزور ملکوں کو دہشت زدہ کر کے انہیں زیرنگیں کیئے ہوئے ہیں۔ جس کی وجہ سے دنیا کا امن غارت ہو رہا ہے۔ مگر ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مقابلہ کی اس دوڑ میں کمزور قوموں اور ملکوں کا تحفظ کرنے والا کوئی نہیں ہوگا۔

اگر وہ مقابلہ کے لئے، اپنے اخراجات فوجی قوت پر خرچ کرتے ہیں تو اس کے نتیجہ میں معاشرہ غربت، مفلسی اور جہالت کا شکار ہو جائے گا۔ پاکستان اس کی ایک مثال ہے کہ فوجی طاقت کے لئے اپنی بنیادی ضرورتوں کو قربان کر کے، اور زیادہ طاقت ور بنا رہا ہے۔

اگر مقابلہ میں شدت آ جائے تو اس صورت میں ملک معاشی اور سماجی طور پر تباہ ہو جاتے ہیں، جیسا کہ روس اور امریکہ میں اسلحہ کی دوڑ کے نتیجہ میں ہوا، روس کو اس کی بھاری قیمت ادا کرنی پڑی، اور اس کا نظام ٹکڑے ٹکڑے ہو کر ختم ہو گیا، پاکستان کو اس سے سبق سیکھنے کی ضرورت ہے۔ ضروری نہیں کہ مقابلہ صرف اسلحہ کی دوڑ میں ہو، اس کا رخ موڑ کر اسے علم و آگہی کی طرف بھی لایا جا سکتا ہے۔ جو قوم کو فوجی قوت سے زیادہ مضبوط کرے گا۔

اس لئے چاہے معاشرے کا اندرونی معاملہ ہو یا قوموں کے باہمی تعلقات کا مقابلہ اور اشتراک زیادہ مفید اور پائیدار ہوتا ہے، مقابلہ کا جنون افراد اور قوموں دونوں کے لئے تباہی کا باعث ہوتا ہے۔

قلم اور تلوار

قلم اور تلوار، علم اور طاقت کی علامتیں ہیں۔ اس لئے کہا جاتا ہے کہ یہ دو متضاد صفتیں ہیں کہ جن میں ملاپ ممکن نہیں ہے۔ مگر تاریخ میں ایسے ادوار ہیں، اور مختلف ادوار میں ایسی شخصیتیں ہوتی ہیں کہ جن میں یہ دونوں اوصاف پائے جاتے ہیں۔ مثلاً قدیم یونان میں ہر شہری کے لئے یہ لازمی تھا کہ جنگ کے موقع پر شہر کا دفاع کرے اور جنگ میں حصہ لے۔ اس لئے ان کے ہاں شہریت کی شرط یہ تھی کہ اسے جنگ میں حصہ لینا ہوگا۔ اس لئے مشہور فلسفی سقراط نے بھی جنگ میں نہ صرف حصہ لیا، بلکہ اپنی بہادری کا ثبوت بھی دیا، اور برف باری میں ننگے پیر اس نے فوجی خدمات سرانجام دیں۔ ایتھنز کی شہری ریاست میں یہ شرط اس لئے لازمی تھی کہ شہر کی آبادی کم تھی، اور جنگ کے موقع پر ہر شہری کے لئے ضروری تھا کہ وہ فوجی خدمات سرانجام دے۔

رومی دور میں ہمیں ایسی شخصیتیں مل جاتی ہیں کہ جو ایک جانب تجربہ کار اور ماہر فوجی جرنیل تھے، تو دوسری جانب بہترین انشاء پرداز اور ادیب، اس کی سب سے اچھی مثال تو سیزر کی ہے کہ جس نے نہ صرف فتوحات کیں، بلکہ اس وقت کے حالات پر خوبصورت انداز میں تبصرے بھی لکھے۔ رومی شہنشاہ مارکس اوری لیس (Marcks Aureilus) جب میدانِ جنگ سے فراغت پاتا تھا تو رات کو فارغ ہو کر لکھنے بیٹھ جاتا تھا، اس کا شمار اپنے وقت کے فلسفیوں میں ہوتا ہے۔

لیکن صاحب سیف و قلم کی یہ روایت رومی زوال کے بعد ختم ہو گئی۔ یورپ میں، عہد وسطیٰ میں جب فیوڈل ازم کا عروج ہوا، اور اس کے ساتھ ہی نائٹس (Knights) کا طبقہ وجود میں آیا، تو اس طبقہ کے لوگوں کے لئے فن حرب میں مہارت حاصل کرنا باعثِ فخر تھا۔ اس وقت تک جنگ کے آلات، اوزار اور ہتھیاروں میں اضافہ ہو چکا تھا، جنگ کے لئے ماہر اور تجربہ کار جنگ جوؤں کی ضرورت تھی۔ اس لئے ان کا وقت تربیت حاصل کرنے اور آپس کے مقابلوں میں گزرتا تھا،

اس لئے ان کو علم کی ضرورت نہیں تھی، لہٰذا وہ خود کو طاقت ور، بہادر اور شجاع تصور کرتے تھے، اور اہل علم ان کے لئے بے عمل، بزدل، اور نرم مزاج لوگ تھے کہ جو جنگ کی سختیوں کی برداشت نہیں کر سکتے تھے، لہٰذا دونوں طبقوں میں دوری ہوتی چلی گئی، اور جنگ جو طبقہ کے لوگ اہلِ علم کو حقارت سے دیکھنے لگے۔

چونکہ جنگ جو طبقہ کا تعلق حکمرانوں سے ہوتا تھا، اس لئے طاقت کے ساتھ ساتھ ان لوگوں کے پاس دولت اور مالی وسائل بھی زیادہ تھے۔ لہٰذا ان کا نظریہ یہ تھا کہ وہ اہلِ علم کو اپنی خدمات کے لئے حاصل کر سکتے ہیں، اور ایسا ہوتا بھی تھا، ان کی جائیداد کے انتظام اور ان کے اخراجات کا حساب کتاب رکھنے والے اہلِ قلم ہی ہوتے تھے۔ ان کی شان میں قصیدے لکھنے والے، اور ان کے جنگی کارناموں کی تفصیل لکھنے والے بھی اہل علم ہوتے تھے۔ اس لئے طاقت اور دولت کی موجودگی میں اہل علم کا سماجی مرتبہ گھٹ گیا تھا۔

شارلیمن جو 8 صدی عیسوی میں اقتدار میں آیا، اور یہ ایک بڑا جنگ جو اور تجربہ کار جرنیل تھا مگر پڑھا لکھا بالکل نہ تھا۔ اس نے جنگوں کے نتیجہ میں ایک بڑی سلطنت کی بنیاد ڈالی، اور یہ خیال آیا کہ اپنی سلطنت میں تعلیم کی طرف توجہ دی جائے۔ لہٰذا اس نے چرچ کی عمارتوں کو بحیثیت اسکول استعمال کرایا، بشپ جو چرچ کا بڑا عہدے دار ہوتا تھا، اس کے ذمہ یہ لگایا کہ وہ اسکول کی نگرانی کرے اور بچوں کو پڑھائے، اس نے کیتھڈرل اسکولوں کی ابتداء کی، جو چرچ میں ہوا کرتے تھے۔ اسے تعلیم کو عام کرنے کی اس قدر دلچسپی تھی کہ یہ اسکولوں میں جا کر بچوں سے سوالات کرتا تھا اور ان کی تعلیمی حالت کا جائزہ لیا کرتا تھا۔ اس نے سلطنت میں لاطینی زبان کو سرکاری زبان بنایا، جس کی وجہ سے اہلِ علم کے تعلقات، جو سلطنت کے علیحدہ علیحدہ علاقوں میں رہتے تھے، بہت بڑھ گئے۔ شارلیمن کی علمی سرپرستی کی وجہ سے اہلِ علم کی قدر ہونے لگی، اور یہ سلطنت کے اہم عہدوں پر فائز ہو کر جنگ جو طبقہ سے مقابلہ کرنے لگے۔

برصغیر ہندوستان میں سلاطین اور مغل بادشاہوں کے دورِ حکومت میں امراء صاحبِ سیف و قلم ہوتے تھے۔ اکثر ان میں دونوں اوصاف ملے ہوئے تھے۔ اکبر نے منصب داروں، منتظمین اور فوجی جرنیلوں کو ایک کر دیا تھا۔ اس لئے ابوالفضل جو ایک تاریخ داں اور انشاء پرداز تھا، وہی میدانِ جنگ میں لڑنے والا بھی تھا، یہ جنگیں لڑتا ہوا، مارا گیا۔ اکبر کا خاص مصاحب بیربر بھی

افغانوں کے ہاتھ جنگ میں مارا گیا، اکبر اور جہاں گیر کے دور کا مشہور جرنیل عبدالرحیم خانِ خاناں، جو فارسی، ترکی اور ہندی کا شاعر بھی تھا۔

اکبر اگر چہ اَن پڑھ تھا، مگر اس نے بھی اہلِ علم کی سرپرستی کی، اور اپنے دربار میں انہیں جمع کر کے ان کی تخلیقی صلاحیتوں کو اُبھارا، اس نے شاندار لائبریری کی بنیاد رکھی، اور سنسکرت کی مشہور کتابوں کے ترجمے کرائے۔

لہٰذا تاریخ میں قلم اور تلوار اگر چہ علیحدہ اور جدا بھی رہے، مگر ان کا ملاپ بھی ہوتا رہا۔ جب یہ دونوں کسی فرد میں یکجا ہوئے تو انہوں نے اس کی شخصیت کو نکھارنے اور دل آویز بنانے میں حصہ لیا، یہ لوگ میدانِ جنگ میں موت کا سامنا کرتے تھے، خوں ریزی، اور قتال کا تجربہ حاصل کرتے تھے، اور جب قلم ہاتھ میں لے کر علمی دنیا میں آتے تھے تو ان کے خیالات اور نظریات کچھ اور ہوتے تھے، اس طرح یہ زندگی کی حقیقتوں سے واقف ہوتے تھے۔ انسانی فطرت کو سمجھتے تھے، اور جب اپنے خیالات کو تحریر کی شکل میں لاتے تھے تو ان میں ان کے احساسات اور جذبات پوری طرح سے اُبھر کر آتے تھے۔

فرداورتاریخی عمل

تاریخ میں یہ موضوع زیر بحث رہا ہے کہ فرد تاریخ کی تشکیل میں اہم کردار ادا کرتا ہے یانہیں، اس کے برعکس سماجی، سیاسی، اور معاشی قوتیں ہیں جو تاریخ کو بدلتی ہیں، یادانشوروں اور مفکرین کے نظریات ہیں۔ جوتاریخ میں اہم کردارادا کرتے ہیں۔ تاریخ میں فرد یا ہیرو کے کردار کا تجزیہ کیا جائے تو اس کے دو پہلو سامنے آتے ہیں، مثلاً ایک جانب تو انہیں اس بات پر سراہا جاتا ہے اوران کی تعریف کی جاتی ہے کہ انہوں نے قوم کو پس ماندگی سے نکال کر ترقی کی جانب گامزن کیا، تو دوسری جانب یہ الزام بھی لگایا جاتا ہے کہ انہوں نے اپنے اختیارات کا ناجائز استعمال کر کے قوم کو نقصان پہنچایا، اور بعض حالات میں تو اسے تباہ و برباد کر دیا۔

اگر تاریخ میں بااثر، بااقتدار اور مکمل اختیارات کی مالک شخصیتوں کا مطالعہ کیا جائے تو ہم پر یہ بات واضح ہو کر آتی ہے کہ ایک فرد جس کے پاس کتنے ہی اختیارات کیوں نہ ہوں، وہ چاہے کسی قدر ذہین اور باصلاحیت کیوں نہ ہو، وہ تنہا حکومت کے تمام کام نہیں کر سکتا ہے۔ اس کے ساتھ ہمیشہ ایسے افراد یا جماعتیں ہوتی ہیں جو اس کی مدد کرتی ہیں۔ اب ہوتا یہ ہے کہ جب ہم کسی کی تعریف کرتے ہیں کہ اس نے قوم کی تقدیر بدل دی تو اس تعریف میں کسی اور کو شریک نہیں کرتے ہیں اور کارناموں کا سہرا ہیرو کے سر باندھ دیتے ہیں، اسی طرح جب کوئی تاریخی شخصیت اپنے آمرانہ اقدامات سے قوم و ملک کو نقصان پہنچاتی ہے تو بھی ہم ایک ہی شخصیت کو موردِ الزام ٹھہراتے ہیں۔ اس نقطۂ نظر کی وجہ سے ہم ان افراد اور جماعتوں کو نظر انداز کر دیتے ہیں کہ جو ان جرائم میں اس کے ساتھ تھیں۔

مثلاً فرانس کے انقلاب 1789ء میں ایک اہم پہلو اس کا دہشت گردی کا ہے کہ جس میں ذرا سے شک و شبہ کی بنیاد پر ہزار ہا لوگوں کو انقلاب دشمن قرار دے کر ان کے سر کاٹ دیئے گئے۔

اس دہشت گردی کا ذمہ دار اکثر ایک شخص یعنی روبس پیر (Robspierre) کو قرار دیا جاتا ہے، حالانکہ اس دہشت گردی کو نافذ کرنے اور عمل میں لانے والا وہ اکیلا نہیں تھا، اس کے ساتھ اس کی پوری جماعت تھی، مگر سب کو موردِ الزام ٹھہرانے کے بجائے، سارا الزام اس کو دے کر اس کی مذمت کر دی جاتی ہے۔ اسی طرح سے جب نازی دور کا ذکر ہوتا ہے تو ہٹلر کو تمام جرائم کا ذمہ دار ٹھہرا دیا جاتا ہے۔ جب کہ یہودیوں کے خلاف نفرت کے جذبات جرمنی میں بہت پہلے سے موجود تھے۔ اسی طرح سے کمیونسٹوں کی مخالفت پہلی جنگ عظیم کے بعد ہوئی، جب کہ کمیونسٹ راہنماؤں کو قتل کر دیا گیا۔ جرمن قوم کی نسلی برتری پر خیالات بھی پہلے سے موجود تھے۔ اس کے علاوہ ہٹلر اکیلا نہیں تھا، نازی پارٹی اس کے ساتھ تھی، بلکہ جرمن عوام کی اکثریت کی حمایت بھی اسے حاصل تھی۔ اس لئے یہودیوں، کمیونسٹوں، اور خانہ بدوشوں کے قتل میں وہ اکیلا نہیں تھا، اس کے ساتھ بہت سے لوگ تھے۔ اس لئے ان سب کو الزام دینے کی ضرورت ہے۔

اس کی روشنی میں جب ہم پاکستان کی تاریخ کا مطالعہ کرتے ہیں تو سب سے پہلے شخص ایوب خاں کہ جنہوں نے فوجی آمریت قائم کی، ان کی آمریت میں وہ اکیلے نہیں تھے، بلکہ ان کا ساتھ دینے والے سیاستداں، نوکر شاہی، دانشور، صحافی اور زندگی سے تعلق رکھنے والے مختلف شعبہ جات کے لوگ بھی تھے۔ ان کی مدد سے انہوں نے بنیادی جمہوریت کا سیاسی نظام نافذ کیا، اور انتخاب جیتا۔ ایوب خان کے بعد ان کے حمایتی اور مددگار پاک صاف ہو کر واپس لوگوں کے پاس آ گئے، اور کسی نے ان کا احتساب نہیں کیا کہ انہوں نے ایک آمر کا ساتھ دے کر ملک و قوم کے ساتھ غداری کی۔

یہی صورت حال یحیٰی خاں کے ساتھ رہی، جب سابق مشرقی پاکستان میں فوجی ایکشن کیا گیا تو مغربی پاکستان میں اکثریت نے ان کی حمایت کی۔ حمود الرحمان کمیشن کی رپورٹ عرصہ دراز تک شائع نہیں کی گئی، اور جب شائع بھی ہوئی تو مکمل نہیں ہوئی، جو لوگ سابق مشرقی پاکستان کے قتل عام کے ذمہ دار تھے، انہیں کچھ نہیں کہا گیا، اور ساری بحث اس پر اب تک ہو رہی ہے کہ اس کا ذمہ دار کون تھا؟ یحیٰی خاں، شیخ مجیب الرحمان یا بھٹو۔ فوج، نوکر شاہی اور سیاسی جماعتیں جنہوں نے اس کی حمایت کی، ان کو نظر انداز کر دیا گیا۔

جب ضیاء الحق آتے ہیں، تو ان کو بھی اپنے حمایتی تلاش کرنے میں دقت نہیں ہوئی،

سیاستدانوں نے ان کی مجلس شوریٰ اور کابینہ میں شرکت کی، دانشور وادیب ان کی بلائی ہوئی اہلِ قلم کانفرنسوں میں خوشی خوشی گئے، ان کے اسلامائزیشن کے عمل کو علماء نے کامیاب بنانے میں مدد دی۔ ان کی فوجی آمریت کو ان سب نے تسلیم کرلیا، اب اکثر اس دور اور اس کی خرابیوں کا واحد ذمہ دار ضیاء الحق کو ٹھہرا دیا جاتا ہے جب کہ ان کے اکثر شریک کار بڑی ڈھٹائی سے اب بھی سیاست میں سرگرم عمل ہیں، اور خود کو بڑا جمہوریت پسند کہتے ہیں، ان کی باقیات نوکر شاہی سے لے کر صحافت، ادب اور سیاست میں آج بھی پوری طرح سے زندہ ہے۔

مشرف جب برسرِ اقتدار آئے تو پاکستان کے روشن خیال اور ترقی پسند دانشور اور سیاستداں ان کی حمایت میں آ گئے۔ انہوں نے جو اقدامات کئے، اب اس کی تمام ذمہ داری ان پر ہے جب کہ اقتدار کے وقت لوگوں کی ایک تعداد ان کے ساتھ تھی۔ اب جب کہ وہ قید و بند میں ہیں، ان کے یہی وفادار ساتھی ان کا ساتھ چھوڑ چکے ہیں، اور وہ تنہا اپنے دور کے الزامات کے جوابدہ ہیں۔

اس لئے سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر کیوں لوگ، ان کو فراموش کر دیتے ہیں، یا ان کا احتساب نہیں کرتے ہیں کہ جنہوں نے آمروں کا پورا پورا ساتھ دیا؟ کیا لوگ ان کے کردار کو اس قدر جلدی بھول جاتے ہیں۔ یا پھر واقعی یہ سمجھتے ہیں کہ ایک فردِ واحد تمام حالات کا ذمہ دار ہوتا ہے۔

اس کی ایک اہم وجہ تو یہ ہے کہ ہم تاریخ کو لکھتے نہیں ہیں، اگر لکھتے ہیں تو اس میں سے ذمہ دار لوگوں کو جو جرائم میں شریک رہے خارج کر دیتے ہیں، اور تاریخ کو سادہ اور سہل بنانے کے لئے تمام الزامات ایک شخص سے وابستہ کر دیتے ہیں۔

ضرورت اس بات کی ہے کہ جن افراد اور جماعتوں نے آمروں کا ساتھ دیا، اور ان کے شریک کار رہے، اور اس کے معاون کار، ان لوگوں کو فوجی آمریت دور کے جرائم کا ذمہ دار ٹھہرانا چاہیئے، ان میں سے اکثر اب سیاسی جماعتوں کے اہم رہنما ہیں، اور اپنی جماعتوں کی وجہ سے اقتدار میں بھی آتے رہے ہیں، مگر تاریخ کے شعور کی نہ ہونے کے باعث یہ بے شرمی کے ساتھ لوگوں کو اپنے خلوص کا یقین دلاتے رہے ہیں۔

ہماری تاریخ کوئی زیادہ پرانی نہیں ہے، اس لئے اس کی تشکیل کی ضرورت ہے تاکہ ان لوگوں کا کردار لوگوں کے سامنے آئے، اور لوگ ان کے اصلی چہروں کو دیکھ سکیں۔

زبانی اورتحریری روایات

تہذیب کے ابتدائی دور میں جب رسم الخط ایجاد نہیں ہوا تھا، عہد و پیان، اعلانات، بحث و مباحثہ اور احکامات زبانی ہوا کرتے تھے۔ اس وجہ سے جو بات کہہ دی جاتی تھی اس کی پاسداری کرنا ہر فرد پر فرض تھا۔ اگر کوئی اس کی خلاف ورزی کرتا تو معاشرے میں عزت و احترام کھو دیتا تھا۔ جب اول اول میسوپوٹامیہ اور پھر دوسری تہذیبوں میں رسم الخط کی ابتداء ہوئی تو معاہدے، اعلانات اور احکامات تحریری شکل میں آنے لگے، مگر زبانی وعدے وعید کی جو روایت تھی وہ ختم نہیں ہوئی بلکہ باقی رہی۔

رسم الخط کے ہونے کے باوجود دو فلسفی ایسے گذرے ہیں کہ جنہوں نے اپنے فلسفہ اور نظریات کو خود تحریر نہیں کیا، یہ سقراط اور کنفیوشس ہیں۔ سقراط تو تحریر کا مخالف تھا اور اس کی دلیل یہ تھی کہ زبانی بحث و مباحثہ میں رد و بدل اور تبدیلی با آسانی ہو سکتی ہے، مگر جب کوئی چیز تحریر کی شکل میں آ جائے تو پھر اس میں تبدیلی کی گنجائش نہیں رہتی ہے، اس کو اسی شکل میں تسلیم کرنا پڑتا ہے۔ اس لئے وہ زبانی گفتگو اور بحث و مباحث پر زندگی بھر عمل درآمد کرتا رہا اور اپنے نظریات کو تحریری شکل نہیں دی۔ مگر اس کے شاگرد افلاطون نے اپنی کتاب ریپبلک میں ڈائیلاگ کی شکل میں اس نے خیالات اور نظریات کو رقم کر دیا ہے، جس کی وجہ سے جو لوگ اس کے نام اور کام سے واقف ہیں، بصورت دیگر زبانی روایات میں گم ہو جاتا۔

کنفیوشس نے خود تو نہیں لکھا، مگر اس کے نظریات کو اس کے شاگردوں نے لکھ کر آنے والی نسلوں کے لئے محفوظ کر دیا۔

زبانی روایات میں مشکل یہ ہوتی ہے کہ وہ وقت کے ساتھ، اور ہر نسل کے ساتھ تبدیل ہوتی رہتی ہے۔ آنے والے لوگ اس میں اضافہ کرتے رہتے ہیں، اس کی وجہ سے اس کا اصل مطلب

ان اضافوں میں گم ہو جاتا ہے، لیکن جب کوئی چیز تحریر کی شکل میں آ جائے تو اس صورت میں اس میں تبدیلی کی گنجائش کم ہوتی ہے، اگرچہ لوگ اس میں بھی جعل سازی کرتے ہیں، اور اضافے کے ساتھ، اس کو اصلی بنانے کی کوشش کرتے ہیں۔

چونکہ زبانی روایات کی ابتداء تحریر سے پہلے ہوئی تھی، اس لئے اس میں زبانی وعدہ کرنے اور اس پر عمل کرنے پر فخر کا احساس ہوتا ہے۔ تاریخ میں بعض ایسی مثالیں ہیں کہ افراد نے جو زبانی وعدہ کرلیا۔ اس کو پورا کرتے ہوئے اگر جان بھی دینا پڑی تو اس سے گریز نہیں کیا۔ اس کی مثال ایک رومی جنرل کی ہے جو اہل کارتھیج کی قید میں تھا، کارتھیج پر فونیقی قوم کے لوگ حکومت کرتے تھے اور ان کی رومیوں سے جنگیں رہیں، جو پیولک جنگیں کہلاتی ہیں۔ کارتھیج والوں نے اس رومی جنرل سے کہا کہ ہم چاہتے ہیں کہ روم کے ساتھ صلح کریں، مگر یہ ہماری شرائط ہیں، ہم تمہیں اس شرط پر چھوڑتے ہیں کہ تم روم میں جا کر سینٹ کے سامنے ہماری شرائط پیش کرو، لیکن اگر روم نے انکار کیا، اور تم وعدہ کے مطابق واپس آئے تو ہم تمہیں قتل کردیں گے۔ رومی جنرل نے واپس آنے کا وعدہ کیا اور کارتھیج کی شرائط لے کر روم گیا، وہاں اس نے سینٹ کے سامنے صلح کی شرائط پیش کیں، اس پر سینٹ میں بحث ہوئی جب اس سے پوچھا گیا کہ تمہاری کیا رائے ہے تو اس نے کہا کہ ان شرائط کو تسلیم نہیں کیا جائے کیونکہ یہ روم کے مفاد میں نہیں ہیں۔ اس کے بعد جب اس نے واپس جانا چاہا تو سینٹرز نے اس سے کہا کہ کیونکہ تمہاری جان کو خطرہ ہے اس لئے اگر تم وعدہ خلافی کرتے ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں ہے، مگر جنرل نے کہا کہ چونکہ وہ وعدہ کر چکا ہے کہ ہر صورت میں واپس آئے گا، اس لئے اگر وہ وعدہ خلافی کرتا ہے تو یہ رومی قوم کی بے عزتی ہے، وہ واپس کارتھیج آیا، اور انہیں بتایا کہ ان کی صلح کی شرائط کو روم میں منظور نہیں کیا گیا، اہل کارتھیج نے اس پر اسے قتل کرادیا۔

عہد وسطیٰ کے یورپ میں جب کہ جنگجو نائٹ طبقہ کا وجود عمل میں آیا، تو یہ لوگ اپنی بہادری کے ساتھ ساتھ اخلاقی روایات کے بھی بڑے پابند تھے۔ ان میں سے ایک روایت یہ تھی کہ اگر کسی سے کوئی وعدہ کیا جائے تو اس کو پورا کرنا ان پر فرض ہے۔ اس لئے یورپ کی تاریخ میں ایسے کئی واقعات ملتے ہیں کہ جب کسی طاقت کو دشمنوں نے گرفتار کرلیا، اور رہائی کے لئے تاوان طلب کیا، اس پر نائٹ نے کہا کہ اسے واپس دیں، وہ تاوان کی رقم لے کر واپس آ جائے گا۔ اس کے دشمنوں کو بھی علم تھا کہ یہ وعدہ کی پابندی کرے گا۔ اس لئے وہ اسے جانے دیتے تھے اور وہ تاوان کی رقم

لے کر واپس آ جاتا تھا۔

لیکن وقت کے ساتھ اخلاقی قدریں بدلتی رہتی ہیں، کہاں ایک وقت تھا کہ لوگ زبان کے کہے پر اعتبار کر لیتے تھے، اور پھر کیا وقت آیا کہ تحریری معاہدوں کی بھی کوئی حیثیت نہیں رہی۔ ہندوستان میں انگریزوں نے ہندوستان کی ریاستوں سے تحریری معاہدے کئے کہ وہ شاہی حکومتوں کو باقی رکھیں گے، مگر جب وقت آیا تو انہوں نے ان معاہدوں کی پرواہ نہیں کی، اور ریاستوں پر قبضہ کر لیا۔ جب 1856ء میں انگریزوں نے فیصلہ کیا کہ اودھ کی ریاست کو ختم کر کے اسے انگریزی علاقہ میں شامل کر لیا جائے تو اس پر اودھ کے حکمراں واجد علی شاہ انگریزوں کو ان کے معاہدے دکھاتے رہے، اور معاہدے کی خلاف ورزی کے بارے میں لکھتے رہے، مگر ان کی ایک نہ سنی گئی اور انگریزوں نے اودھ پر قبضہ کر لیا۔ لہٰذا معاہدوں کی خلاف ورزی میں سیاسی مقاصد کو بڑا دخل ہوتا ہے۔

لیکن پس ماندہ معاشروں میں جہاں اخلاقی اقدار کمزور ہوں، اور ان کی پابندی کرنے پر کوئی تنقید نہ ہو، تو اس صورت میں زبانی وعدوں، یا تحریری عہد ناموں کی بھی کوئی حیثیت نہیں ہوتی ہے۔

اگرچہ ہمارے ہاں اب تک یہ محاورہ تو موجود ہے کہ میں نے فلاں معاملہ میں زبان دی ہے، مگر اس کے ساتھ ہی اس زبان کی خلاف ورزی کرتے ہوئے کسی کو اب شرم نہیں آتی ہے۔

جب کسی معاشرے میں زبان اور تحریری وعدوں، اور عہد ناموں کا پاس نہ رہے تو پھر ایسے معاشرے میں لوگوں کا اعتبار ختم ہو جاتا ہے، اور اس کی جگہ دھوکہ، فریب اور چکمہ دینے کا رواج ہو جاتا ہے، جو معاشرے کو اندر سے کھوکھلا کر دیتا ہے۔

مراعات

تہذیب کے ارتقاء اور ترقی کے ساتھ، معاشرہ میں افراد اور طبقات کے درمیان امتیاز اور تفریق پیدا ہوئی۔ جن افراد کے پاس طاقت، اقتدار، اور دولت تھی، وہ خود کو دوسروں سے علیحدہ اور برتر ثابت کرنا چاہتے تھے۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے مختلف طریقوں کو استعمال کیا کہ جن کی وجہ سے وہ دوسروں سے علیحدہ نظر آئیں۔ اس فرق کو پیدا کرنے میں مراعات کا سب سے زیادہ دخل تھا۔ مراعات سے مطلب یہ تھا کہ انہوں نے اپنے لئے خاص علامتیں، نشانات، اور روایات کو قائم کیا تا کہ ان کے اور عام لوگوں کے درمیان فرق واضح ہو جائے۔

مثلاً اکثر معاشروں میں مراعات یافتہ طبقے کے لباس کو صرف ان سے مخصوص کر دیا گیا تھا اور عام لوگوں کو اجازت نہیں تھی کہ ان جیسا لباس پہنیں۔ چین میں سلک کے لباس کو صرف طبقہ اعلیٰ کے لوگ استعمال کر سکتے تھے، اس طرح رنگین کپڑوں پر بھی پابندی تھی، ارغوانی رنگ خاص طور سے بادشاہ استعمال کرتے تھے، اس رنگ کا لباس دوسروں کو استعمال کرنے کی اجازت نہیں تھی۔

لباس کے بعد سواری آتی ہے۔ ایک زمانہ میں گھوڑے کی سواری صرف امراء کر سکتے تھے۔ ان کے لئے خاص قسم کی گاڑیاں ہوتی تھیں، جو قیمتی ہونے کی وجہ سے ویسے بھی عام لوگوں کی دسترس سے باہر تھیں، مگر ان میں عام لوگ سفر نہیں کر سکتے تھے۔

اسی طرح ہتھیار رکھنے کا حق بھی امراء اور مراعات یافتہ طبقوں کو تھا۔ عام لوگ ہتھیار نہیں رکھ سکتے تھے۔ اس مراعات میں جہاں ہتھیار طاقت اور اقتدار کی علامت تھا، اس لئے اس پر امراء کا حق تھا۔ وہیں وہ خوف زدہ بھی تھے کہ اگر عام لوگوں کو اس کی اجازت مل گئی تو بغاوت کر سکتے ہیں، اور ان کے خلاف ہتھیار اُٹھا سکتے ہیں۔

یورپ میں امراء کا طبقہ اس سلسلہ میں بہت زیادہ حساس تھا کہ اس کی حیثیت اور امتیازی

خصوصیت کا ہر موقع پر اظہار ہونا چاہئے، اس لئے چرچ کی عبادت کے موقع پر ان کی نشستیں علیحدہ ہوتی تھیں، میوزک ہال میں بھی ان کے لئے علیحدہ سے جگہیں ہوتی تھیں جو زیادہ دولت منداور شاہی خاندان سے تھے، ان کے لئے علیحدہ سے مخصوص نشستیں ہوتی تھیں۔

عام لوگوں کے لئے لازمی تھا کہ جب ان سے بات چیت کریں، یا ان سے مخاطب ہوں تو انہیں ہز ہائی نیس (His Highness) یا ہز اگزالٹ سر (His Exalled Sir) کہہ کر ان سے بات کریں، ان کے سامنے ادب سے آئیں، گفتگو کرتے وقت سر جھکائے رکھیں اور مختصر الفاظ میں اپنا مدعا بیان کر دیں۔

برصغیر ہندوستان میں بھی مراعات یافتہ طبقے، اپنی مراعات کے سلسلہ میں بڑے محتاط تھے۔ جب امراء باہر نکلتے تھے تو یہ یا تو پالکی میں سفر کرتے تھے، یا ہاتھی پر بیٹھے ہوئے خاص حوضے میں، یا گھوڑے پر، پیدل چلنا بے عزتی کی بات تھی۔ اس لئے انہیں پیدل دیکھ کر ان کی ساری عزت و احترام ختم ہو جاتا تھا۔ ہمارے ہاں آج بھی محاورے کے طور پر کسی شخص کی مفلسی یا ذہنی کھوکھلے پن کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ شخص فلاں معاملہ میں پیدل ہے۔ عام لوگ تو پیدل ہی چلا کرتے تھے، اس لئے ان کی کوئی عزت یا احترام نہیں تھا۔ دوسرے یہ کبھی اکیلے سفر نہیں کرتے تھے۔ ان کی ہمیشہ سواری ہوا کرتی تھی۔ اب یہ امیر کی دولت اور اس کے عہدے پر تھا کہ اس کی سواری میں کتنے لوگ ہوں گے۔

اگر امیر بڑا عہدہ دار ہوتا تھا تو اس کے ساتھ گھوڑے، ہاتھی، پالکیاں اور ہتھیاروں کی پلٹن ہوتی تھی۔ راستے میں یہ غریب لوگوں پر پیسے بھی نچھاور کرتے جاتے تھے تا کہ ان کی فیاضی اور سخاوت کے قصے لوگوں میں پھیلیں۔

امراء میں اپنی مراعات کے لئے بھی مقابلہ ہوتا تھا۔ مثلاً خطابات کے سلسلہ میں کوشش کی جاتی تھی کہ بادشاہ سے اپنے لئے زیادہ سے زیادہ پُرشکوہ خطابات لیں۔ مغل دور کے آخر میں جب زوال ہو رہا تھا، اور مغل شان و شوکت دم توڑ رہی تھی، اس وقت بھی امراء کا طبقہ ان خطابات کے لئے لڑ رہا تھا کہ جس کے وہ اہل نہ تھے، مثلاً جن لوگوں نے کبھی میدانِ جنگ کی شکل نہ دیکھی ہو، وہ فیروز جنگ، بہادر اور دلاور خاں کے خطابات سے اپنی شخصیت کو بڑھا رہے تھے۔ مراعات کے سلسلہ میں یہ بات یاد رکھنی چاہئے کہ جب کسی فرد کی شخصیت کھوکھلی ہو جاتی ہے۔ جب اس میں اتنی

صلاحیت، لیاقت اور ذہانت نہیں ہوتی ہے کہ وہ کوئی کارنامہ سرانجام دے سکے، کوئی تخلیق کر سکے تو ایسے افراد اپنی خاندانی حیثیت، دولت اور سفارش سے مراعات کے ذریعہ اپنی کھوکھلی، کمزور، اور بے حیثیت شخصیت کو لوگوں کی نظر میں اہم بنانا چاہتے ہیں، اور اس مقصد کے لئے وہ جدوجہد کرتے ہیں، اور کوشش کرتے ہیں کہ خود کو دوسروں سے افضل بنائیں۔

جمہوری دور میں شاہی خاندان اور امراء کی یہ مراعات تو ختم ہو گئیں، جب فرانس میں 1789ء میں انقلاب آیا تو اس میں سب سے اہم نعرہ مساوات کا تھا، انہوں نے امراء کی تمام مراعات کو ختم کر کے انہیں عام لوگوں میں شامل کر لیا، یہ سلسلہ یورپ کے دوسرے ملکوں میں بھی پہنچا اور وہاں بھی آہستہ آہستہ یہ خاندانی مراعات ختم ہوئیں، یا کمزور ہوئیں۔

پاکستان میں ہمارا صاحب اقتدار طبقہ مراعات کے بارے میں بہت زیادہ فکرمند رہتا ہے، اس لئے یہاں پہلے وی۔آئی۔پی کلچر تھا، اب وی۔وی۔آئی۔پی کلچر کا اضافہ ہو گیا ہے۔ جو افراد اس کلچر کو باقی رکھنا چاہتے ہیں یہ وہ لوگ ہیں کہ جن کی شخصیت میں کوئی اثر نہیں ہے، انہوں نے معاشرے کی ترقی میں کوئی حصہ نہیں لیا ہے۔ یہ نہ تو صاحب علم ہیں، یا سائنسدان، مفکر، یا کسی پیشہ کے ماہرفن۔ مگر جاگیرداروں، اور قبائلی سرداروں کے پاس چونکہ دولت ہے لہٰذا اس کے ذریعہ یہ خود کو ممتاز بنانا چاہتے ہیں۔ اس لئے یہ رواج ہو گیا ہے کہ جب بھی باہر جایا جائے تو ان کے ساتھ گارڈز کا عملہ ہو، جو ہتھیار بند ہوں، اور لوگوں کو دہشت زدہ یا خوف زدہ کر دیں۔ اب اس کا یہ بہانہ کیا جاتا ہے کہ انہیں حفاظت کی ضرورت ہے۔ وزراء اور دوسرے عہدے دار جب نکلتے ہیں تو کاروں کا ایک قافلہ ان کے ساتھ ہوتا ہے، اس موقع پر سڑکوں پر تمام ٹریفک کو بند کر دیا جاتا ہے، تاکہ ان کی سواری آرام سے گزر سکے۔ ان کی کاروں پر جھنڈے ہوتے ہیں جو ان کے عہدے اور مرتبہ کا اعلان کرتے ہیں۔ دعوتوں میں ان کے لئے مخصوص نشستیں ہوتی ہیں۔ اگر دعوت بڑے پیمانے پر ہو تو ان کے لئے علیحدہ سے راستے مقرر ہوتے ہیں۔

اپنی شخصیت کی شان و شوکت کو دکھانے کے لئے گارڈز رکھنے کا رواج اس قدر بڑھ گیا ہے کہ اب علماء بھی جن کے پاس پیسہ کی کمی نہیں ہے، اپنے ہمراہ گارڈز رکھتے ہیں تاکہ وہ بھی دوسرے مراعات یافتہ طبقوں کی طرح خود کو ان میں شامل کر لیں۔

پاکستان میں مراعات کے پیچھے، افراد اور طبقوں کا احساس کمتری ہے، جب کوئی فرد اپنی

شخصیت یا کام کے ذریعہ لوگوں کو متاثر نہیں کرسکتا ہے تو پھر وہ مراعات کا سہارا لے کر اپنی شخصیت کو اُبھارتا ہے۔ اگر اس سے یہ مراعات چھین لی جائیں تو اس کی شخصیت گمنام ہو جاتی ہے، اور یہ جب ہوتا ہے کہ جب کوئی وزارت سے محروم ہو جائے، اور اس کی دولت کے ذرائع ختم ہو جائیں، اور اقتدار باقی نہ رہے تو پھر یہ عام لوگوں کے مجمع میں شامل ہو کر اپنے ماضی کی یادوں میں گم رہتا ہے۔

سوچنا یہ ہے کہ لوگوں میں احترام مراعات کی علامات سے نہیں ہوتا ہے، بلکہ فرد کے کاموں اور معاشرے کی ترقی میں اس کا حصہ لینے سے ہوتا ہے۔ یہ فرد پیدل بھی چلتا ہے اور بغیر گارڈز کے بھی ہوتا ہے، مگر لوگوں میں اس کے لئے عزت و احترام کے جذبات ہوتے ہیں۔

باغوں کا شہر حیدرآباد سندھ

انسان نے جب شہر آباد کئے، بستیاں بسائیں، تو اس کا فطرت سے تعلق ٹوٹ گیا جو اپنے ابتدائی دور میں جنگلوں، پہاڑوں، اور وادیوں سے جڑا ہوا تھا۔ لیکن فطرت سے اس کا لگاؤ درختوں، پرندوں اور جانوروں سے رہا، درخت شہروں میں اسے سرسبز اور آباد جنگلوں کی یاد دلاتے تھے، اور اسے فطرت سے جوڑے رکھتے تھے۔

تہذیب کی ترقی کے ساتھ باغ کا تصور اُبھرا، یہ ایک وسیع قطعہ زمین میں درختوں اور پودوں کو ایک قاعدے کے ساتھ لگایا جائے اور فطرت سے جو رشتہ ٹوٹ گیا ہے، اسے ان باغوں کی شکل میں قائم رکھا جائے۔ لیکن باغوں کے اس قیام میں جن ذرائع کی ضرورت تھی وہ عام لوگوں کے پاس نہیں تھے، یہ حکمرانوں کے پاس تھے، اس لئے باغوں کی بنیاد میں اور ان کی تشکیل میں ان کا حصہ رہا۔

بابل کی تہذیب میں ہمیں معلق باغات (Hanging Gardens) کی تاریخ ملتی ہے، جو حکمرانوں نے اپنے محلات کی چھتوں پر لگائے تھے تاکہ وہ نہ صرف آب و ہوا کو تبدیل کر سکیں، بلکہ ان کی خوبصورتی سے بھی لطف اٹھائیں۔ حال ہی میں ماہرین آثارِ قدیمہ نے ان باغات کے نشانات دریافت کئے ہیں جنہوں نے ان کی تاریخی حقیقت کو ثابت کر دیا ہے۔

ایران میں بادشاہ اپنے محلات کے گرد، یا علیحدہ باغات کی بنیاد رکھتے تھے، جو چار دیواری میں تھے تاکہ عام لوگوں کی نظروں سے دور رہیں۔ یہ باغ پیراڈائز کہلاتے تھے، جسے اب ہم جنت کے معنوں میں استعمال کرتے ہیں، جنت کے معنی بھی باغ ہی کے ہیں۔ باغ عدن کا تصور ایک عرصہ تک یہ تھا کہ یہ زمین پر ہے اور وقت کے ساتھ گم ہو گیا ہے، عہدِ وسطیٰ میں لوگ باغ عدن کی تلاش میں رہے، جب امریکہ دریافت ہوا تو کچھ عیسائی مشنریوں کو جنوبی امریکہ پر سرسبز اور گھنے

جنگلوں میں باغ عدن کے نشانات ملے۔

لہٰذا ابتدائی دور میں یہ باغات حکمرانوں یا امراء کی ملکیت ہوتے تھے، عام لوگوں کے لئے باغات نہیں ہوتے تھے، سیزر کے قتل کے بعد جب انٹونی نے اس کی وصیت پڑھی تو اس نے اپنے باغ کو عوام کے نام کر دیا تھا کہ وہ وہاں جا کر لطف اندوز ہوں، لوگ اس کی اس وصیت سے اس قدر متاثر ہوئے کہ سیزر ان کا ہیرو بن گیا۔

ہندوستان میں بھی حکمراں اور امراء باغات کی بنیاد رکھتے تھے۔ بابر نے ہندوستان کی فتح کے بعد سب سے پہلے کام یہی کیا تھا کہ آگرہ میں باغ کی بنیاد رکھی تھی۔ عہد وسطیٰ کے حکمراں، اپنے مقبروں کے اردگرد بھی باغات لگواتے تھے تا کہ لوگ آئیں اور وہاں چہل پہل رہے۔

یورپ میں جمہوریت کے ساتھ ہی، پبلک گارڈن یا ایسے باغات کا تصور اُبھرا کہ جو عوام کے لئے تھے۔ ہندوستان میں ایسٹ انڈیا کمپنی کی حکومت کے دوران کمپنی باغ کا سلسلہ شروع ہوا۔ اس کے ساتھ ہی یونیورسٹیوں میں بوٹانیکل گارڈن کی بنیاد رکھی گئی کہ جہاں طالب علم اور استادان پر ریسرچ کرتے تھے۔ لندن میں کیو گارڈن کا قیام عمل میں آیا، جس کا مقصد تھا کہ دیکھا جائے کہ کون سے پودے اور درخت کس آب وہوا میں نشو ونما پاتے ہیں۔ اس تحقیق کے نتیجہ میں برازیل کے ربر کے درخت، تجربہ کے بعد ملائشیا میں لگائے گئے۔

باغات کے قیام کی وجہ سے نہ صرف شہروں کی خوبصورتی بڑھ گئی بلکہ انہوں نے فضائی آلودگی کو بھی کم کیا۔ یہ باغات نہ صرف لوگوں کو تفریح مہیا کرتے تھے، بلکہ ان کی سماجی سرگرمیوں کا بھی مرکز تھے۔

حیدرآباد سندھ ایک زمانے میں باغوں کا شہر کہلاتا تھا، مجھے یاد ہے کہ جب میں پہلی مرتبہ 1952ء میں حیدرآباد میں آیا ہوں تو یہاں باغوں کی کثرت تھی، ریلوے اسٹیشن سے باہر نکلتے ہی ایک باغ تھا، آگے آئیں تو اب جہاں جوتوں کی مارکیٹ ہے یہاں ایک خوبصورت باغ تھا، کینٹ میں پریم پارک تھا، جہاں اب بنگلے اور فلیٹس بن گئے ہیں، رانی باغ تھا کہ جس میں چڑیا گھر بھی تھا، یہ باغ اب بھی ہے مگر خستہ حالت میں۔ پھلیلی جاتے ہوئے آفندی باغ تھا۔ گول بلڈنگ جو گورنمنٹ ہائی اسکول کے ساتھ ہے یہ بھی ایک چھوٹا سا باغیچہ تھا، اسی قسم کا باغیچہ سول ہسپتال کے پاس تھا۔

گورنمنٹ کالج کے عقب میں ایک بڑا خوبصورت باغ دھلند اس کے نام سے تھا، پھلیلی نہر کے ساتھ ساتھ ایک باغ تھا، جس میں فوارے بھی تھے، جہاں اب خوجہ کالونی ہے۔ یہ امرودوں کا باغ کہلاتا تھا، ہیرآباد میں گروسنگت کی عمارت میں زنانہ اور مردانہ باغیچہ تھے۔

لطیف آباد جب بسا تو اس میں یوٹ نمبر 6 میں ایک باغ تھا، جو ابھی بھی ہے، مگر اچھی حالت میں نہیں ہے۔ حیدرآباد میں باغات کے خاتمہ نے اس شہر کو پلازوں اور دوکانوں کے شہر میں تبدیل کر دیا ہے۔ باغات کی غیر موجودگی نے نہ صرف شہر کی فضا کو آلودہ رکھا ہوا ہے، بلکہ شہر فطرت سے ٹوٹ کر سیمنٹ اور لوہے کی چار دیواری میں گھر گیا ہے۔ اس نے لوگوں کے ذہن اور طبیعت کو بھی بدل ڈالا ہے۔